اُمیدِ سحر

(ایک سیاسی طالبہ کی جیل میں لکھی ہوئی ڈائری)

اختر بلوچ

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

''اُمید سحر کی بات سنو''

جگر دریدہ ہوں چاک جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زبان بُریدہ ہو زخم گلو سے حرف کرو
شکستہ پاہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافِر رہ صحرائے ظلمت شب سے
اب التفاتِ نگار سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امید سحر کی بات سنو

(فیض احمد فیض)

اُمیدِ سحر

(ایک سیاسی طالبہ کی جیل میں لکھی ہوئی ڈائری)

اختر بلوچ

"ناری پبلیکیشن"

443/3 صدر حیدر آباد (سندھ)

ناری پبلیکیشن کی اٹھالیسویں کتاب

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

نام کتاب: اُمیدِ سحر

موضوع: جیل کی ڈائری

مصنفہ: اختر بلوچ

پہلا ایڈیشن: (انڈیا میں) 1972

دوسرا ایڈیشن: (پاکستان میں) 1988

تیسرا ایڈیشن: (اردو میں پاکستان میں) 2009

ناشر: نذیر ناز

ناری پبلیکیشن 44/3 صدر حیدر آباد سندھ

تعداد اشاعت: ایک ہزار

پیسٹنگ: سہیل سلام بھٹو

کمپوزنگ: سعد اللہ بھٹو

پریس: سندھیکا

قیمت: 150 روپے

Umeed-e-Sahar
A book of jail Diary
Written by: Akhtar Baloch
First Edition: 1972 India
Second Edition: 1988 Pakistan
Third Edition: 2009 Pakistan in Urdu
Publisher: Nazeer Naz
Publication: Nari Publication 3/443 Sadar Hyderabad
Rs: 150 Rupees

انتساب

محترمہ شہید رانی بینظیر بھٹو کے نام

جس نے میری طرح سکھر جیل کی

کوٹھری میں قید و بند کی صعوبتیں

حوصلے سے برداشت کیں

اور جمہوریت کی خاطر

شہادت کا جام نوش کیا۔

پبلشر نوٹ

پھر ٹوڑیں گے ہم زنجیریں ہر لب کو آزاد کردیں گے
جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہر وفا آباد کریں گے۔

(حبیب جالب)

ناری پبلیکیشن کی طرف سے صوبہ سندھ کی بہادر بیٹی اختر بلوچ کی کتاب **''اُمیدِ سحر''** کو بڑی فخر کے ساتھ پیش کرتے ہوئے دلی سکون کے ساتھ ساتھ بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ ناری پبلیکیشن پہلی سندھی عورت کی طرف سے قائم کردہ چھوٹا سا پبلکیشن ادارہ ہے اور سب سے قابل فخر بات یہ ہے کہ سندھ کی تاریخ میں پہلی کم عمر لڑکی ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کے سلسلے میں جیل گئی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جیل کی ڈائری لکھی، کم عمری میں جیل جانے کے پہلے اعزاز کے ساتھ میں پہلی ڈائری لکھنے کا اعزاز بھی اختر بلوچ کو حاصل ہوا ہے۔ اختر بلوچ کا تعلق سیاسی گھرانے سے ہے، ایسا سیاسی گھرانہ جس کی ساری زندگی جدوجہد میں گذری اور گذر رہی ہے، جس کی زندہ مثال ادی زرینہ بلوچ ہے۔ اختر بلوچ قابل احترام محترمہ خاتون زرینہ بلوچ کی بیٹی ہیں۔ ادی زرینہ بلوچ جو شاعرہ، نثر نگار، صداکارہ، اداکار اور لوک فنکارہ تھیں، ان کی ساری عمر خواتین میں بیداری کا جذبہ بیدار کرنے کے ساتھ سندھی قوم کو خواب غفلت سے جگانے کیلئے گیت لکھنے میں گذری اور گاؤں گاؤں شہر شہر میں گیت گائے۔ قومی یکجہتی کے ساتھ محبت کا پیغام جب تک زندہ رہیں دیتی رہیں۔ اختر بلوچ میں لکھنے کا انداز وراثت

سے منتقل ہوا تھا، تب ہی اتنی کم عمری میں اپنے قلم پر گرفت بہت مضبوط تھی۔

ڈائری میں جیل کے حالات کا گہرا مشاہدہ۔عورت کے دکھ کا مطالعہ موجود ہے، وہ صرف جیل میں موجود قیدی خواتین کا بیان نہیں کرتیں بلکہ جیل میں مقید قید و بند کی حالات بھی لکھتی گئیں ہیں، لکھنے کے انداز میں روانی اور رومزہ کے واقعات اثر انگیز ہیں۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی کمسنی میں اختر بلوچ میں اتنی جرئت کہاں سے آئی، ۱۹۷۰ء میں سندھ کی خواتیں اتنی بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ جبکہ اتنے اخبارات بھی نہیں نکلتے تھے۔ نہ میڈیا اتنا پر اثر تھا۔ اب کا زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ اب تو ہمارے ذہنوں کو بیدار کرنے کے لئے میڈیا میدان میں ہے۔تب بھی ہماری لڑکیاں ماں کے بغیر ایک قدم بھی چل نہیں سکتیں۔

۱۹۷۰ع میں اختر بلوچ نے بھوک ہڑتال کی۔ آمرانہ دور میں اتنی جرئت کہاں سے آئی، وہ کون سی قوت تھی جو کم عمری میں اختر بلوچ کو باطل سے لڑنے اور حق کی خاطر آواز اٹھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ درحقیقت وہ قومی جذبہ جو بچپن سے اس کی دل میں پرورش پا رہا تھا۔ جب آواز حق بلند کرنے پر نوجوانوں پر ظلم وستم شروع کیا گیا تو اختر بلوچ کے دل میں جوش وولولہ پیدا ہو گیا۔ اُس کو یہ احساس ہوا کہ یہ ظلم ہے اور ظلم کے خلاف اس نے آواز بلند کی، منصور حلاج نے ایک ہی نعرے سے لوگوں کے ضمیر کو جگا دیا تھا۔ اس طرح معصوم لڑکی کی بھوک ہڑتال نے جو جدوجہد تھم سی گئی تھی اس تحریک میں از سر نو جان ڈال دی۔

حقیقت میں انسان صدیوں سے آزادی سے سانس لینے اور ایک ایسے معاشرے کی جستجو میں ہے جو اس کی زندگی کی ضروریات کا کفیل اور اس کی تخلیقی قوتوں

کے تکمیل کا ضامن ہو۔

لیکن انسان کی یہ بدقسمتی ہے کہ اب تک جتنے بھی معاشرتی نظام قائم ہوئے ہیں۔ ان میں جبر واستبداد اور عدم مساوات کی قوتیں اقدار میں رہی ہیں، گران کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ عام آدمی اپنی مصلحتوں کی وجہ سے ان قوتوں سے مفاہمت کر لیتا ہے اور نظام استبداد کو تسلیم کرنے میں اپنی عافیت سمجھ لیتا ہے۔ اگر وہ کبھی سر اُٹھاتا ہے تو پھر جبر کی ایڑی اسے وہیں سر اُٹھانے سے پہلے کچل دیتی ہے۔ صدیوں سے یہ جاگیردارانہ نظام جس کی بنیاد ہی انسان کی تذلیل پر ہے۔ جس ماحول میں آمرانہ جبر حاوی ہو، اس ماحول میں نازک لڑکی کا یہ جرائت مدانہ اقدام قابل تعریف ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تلقین بھی ہے۔

اختر بلوچ نے جیل کے اندر جو قیدی عورتیں دیکھیں تھیں کیونکہ ہر عورتوں کے ہاتھوں کوئی نہ کوئی جانے انجانے میں جرم ہوا تھا۔ ہر عورت کی ایک قدر مشترکہ تھی کہ ہر عورت دکھی تھی ہر عورت کا گھر اُجڑا ہوا تھا، جن پر دہشت و بربریت اور موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ یاد رفتگان وگم شدگان سے دل بوجھل پسماندگانہ کی بی چارگی ودرماندگی کا تفکر۔

لیکن اس ماحول میں یہ معصوم لڑکی جو قوم کا درد دل میں سمائے اور سچ بولنے کے جرم میں ان عورتوں کے ساتھ مقید تھی۔ لیکن بلند حوصلے کے ساتھ ان قیدی عورتوں کے دکھ درد کو محسوس کرتی ہے اور ان کی ہمت بڑھاتی ہے اور حوصلہ دیتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک بہادر ماں زرینہ بلوچ کی بیٹی ہے ایسی ماں کی بیٹی جو جب تک زندہ رہی جبر وظلم کے خلاف آواز بلند کرتی رہی۔ اپنے دیس کے نوجوانوں کو صبر واستقلال کے ساتھ آزادی کا نغمہ سناتی رہیں اور یہ پیغام دیتی رہی ''زندہ رہو تو شان سے زندہ رہو۔''

ادی زرینہ بلوچ میری دوست تھیں پرخلوص سچی دوست جس نے قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور دکھ سکھ میں میرا ساتھ دیا۔ میں نے ادی زرینہ بلوچ کے ساتھ اکھٹے وقت گذارا ہے، ہم نے بیٹھ کر مختلف ادب، تاریخ موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ ایک ساتھ ہم نے سفر کئے ہیں، دوران سفر میرا اور عربیہ نور کا بہت خیال رکھتی تھیں، اپنی ضروریات کو بھول کر ہماری ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس میں ممتا اور محبت کا جذبا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ادی زرینہ ہر وقت یہی کہتی تھیں کہ محبت کرو، سب سے محبت وخلوص کے ساتھ پیش آؤ کیونکہ زندگی چند روزہ ہے اور کام کرو دوسروں کے کام آؤ۔ بہت بڑی فنکارہ تھیں۔ لیکن ان میں غرور بلکل نہیں تھا۔ وہ درویش صفت تھیں میری طرح بیگمات کی ملاقات سے ان کو کوفت اور پریشانی ہوتی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہیں میرا سہارا بنی رہیں، ان کی بچھڑنے کے بعد تنہا رہ گئی ہوں۔

لیکن آج جب یہ حروف لکھ رہی ہوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ادی میرے سامنے بیٹھی مجھے دیکھ رہی ہیں، اور خوش ہو رہی ہی، کہ نذیر تم نے جیل کی ڈائری شایع کر کے میری خواہش پوری کردی ہے۔ ادی زرینہ کو یاد کرتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں، اب زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتی، بس دعا کریں اللہ پاک مجھے حوصلہ وصبر دے اور کچھ نہیں کر سکتی تو کیا؟ اس بہادر لڑکی کی کتاب شایع کر کے اپنا کچھ قومی فریضہ سرانجام تو دے سکتی ہوں۔

فقط آپ سب کی

نذیر ناز

30-3-2009

پیش لفظ

''اُمیدِ سحر'' (قیدی عورت کی ڈائری) یہ تین الفاظ ہی ولولہ انگیز ہیں۔ ان الفاظ سے ہی جذبات میں حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ میں کسی قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ سندھ کی بیٹی ادی اختر بلوچ کی قید کی یہ ڈائری کسی قیدی عورت کی کوئی پہلی ڈائری ہے! مگر مختلف احباب سے معلوم کرنے کے بعد بھی کم سے کم میرے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ سندھ میں، پاکستان میں، ہندوستان میں، حتیٰ کہ دنیا کے کسی ملک میں کسی قیدی عورت کے قید کی ڈائری شایع ہوئی ہو۔ بہرحال اگر دنیا کے کسی حصے میں ایسی کوئی کتاب شایع ہوئی بھی ہے تو اس کی تعداد شاید ایک دو سے زیادہ نہیں ہے۔ لہذا ایسی ڈائری اس سے ہی لکھی گئی ہے یا نہیں، دونوں صورتوں میں ادی اختر بلوچ کو اس بات کا کریڈٹ دیئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ انہوں نے قید کی ڈائری لکھ کر ایک ایسا کارنامہ ضرور سرانجام دیا ہے جس کا نظیر تلاش کیا جارہا ہے۔ اس ڈائری میں جہاں سندھ کی اس وقت کی سیاسی صورتحال کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہیں سندھ کے جیلوں میں قید خواتین قیدیوں کی مخصوص صورتحال، ان کے خاندانی پسمنظر، حتیٰ کہ ان کے جیل میں مقید ہونے کے انتہائی حیرت انگیز پسمنظر سے پہلی بار پردہ ہٹایہ گیا ہے۔

ادی اختر بلوچ کی ''قیدیانی'' کی ڈائری سب سے پہلے ممبئی، ہندوستان سے نئی دنیا پبلشرس نے ۱۷ آکتوبر ۱۹۷۳ء میں شایع کی لہٰذا اس وقت تو کسی ایسی

کتاب کی اشاعت یقیناً ایک کارنامہ ہی تھا مگر، سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی بڑا کارنامہ سندھ کی ایک صغیر لڑکی کا سندھ اور سندھ کے عوام کے جائز مفادات کے حصول کے لئے ایک فوجی حکومت کے دور میں گلیوں اور راستوں پہ آ کے طبل جنگ بجانا اور سندھ کے عوام کے سیاسی حقوق کے لئے بھوک ہڑتال پہ جانے کی پاداش میں جیل میں جانا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں یحیٰ خان کا مارشل لاء تھا، اور ایسے جرائم کے مرتکب لوگوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمے چلا کے سخت سے سخت سزائیں سنائی جارہی تھیں۔ ادی اختر بلوچ کی یہ کتاب اس قید کے بارے میں یہ جوانہوں نے ۲۴ جولائی ۱۹۷۰ء سے کاٹی اور یہ جیل یاترا ان کو گرفتار طلبا اور دیگر سیاسی رہنماؤن کی رہائی اور سندھ کے دیگر حقوق کی حمایت میں حیدرآباد میں بھوک ہڑتال پر بیٹھنے کی پاداش میں کرنی پڑی، اس قید سے ان کی رہائی ۸ ڈسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئی جب ملک میں عام انتخابات کے نتائج آ چکے تھے۔ اس سے پہلے ادی اختر بلوچ سندھ میں زمینوں کا نیلام رکوانے کے لئے سندھ بھر میں شروع کی گئی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں ۲۶ اور ۲۷ مارچ ۱۹۷۰ء کو جیل میں بند رہی۔ اس سے بھی پہلے ۱۹ نومبر ۱۹۶۹ع کو ووٹر فہرستیں سندھی زبان میں شایع کرنے اور ون یونٹ کے خاتمے کے لئے بھوک ہڑتال پر بیٹھنے کی وجہ سے اختر بلوچ کو پہلی بار گرفتار کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر فقط ۹ سال تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا تصور ہی کم وحشتناک نہیں کہ سندھ کے فیوڈلسٹ معاشرے میں ۶۰ء کی دہائی میں ایک چھوٹی بچی اپنی دھرتی اور سندھی عوام کے

حقوق کی حمایت میں وقت کے فوجی ڈکٹیٹر کو چیلنج کرتے ہوئے آ کر ایک شاہراہ پر بھوک ہڑتال پر بیٹھے۔ یہ وہ وقت تھا جب فوجی آمریت کو چیلنج کرنے کی روایت نہیں پڑی تھی۔ اس کے علاوہ اس دور میں سندھ میں فیوڈلزم کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس چھوٹی سی بچی کی اس جدوجہد کو اس وقت تقریباً ۳۷ سال ہونے کو آ رہے ہیں مگر آج تک ہمارے ملک کے اور خاص طور پر صاف اور شفاف میگا شہر کے کسی صاف اور شفاف دانشور، سقراط اور بقراط کو کبھی اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس بچی کی اس جرئت کی تعریف تو کیا اس کو رکارڈ پر لا سکے، اور یہ کہے کہ سندھ کی خواتین نے کس طرح فیوڈلزم اور فوجی آمریت کو چیلنج کیا ہے؟

ان دنوں میں مسلم کمرشل بینک میں ایک افسر کے طور پر بھرتی ہونے کے بعد کراچی میں ضروری تربیت حاصل کر رہا تھا۔ میں اس دن حیدرآباد میں تھا۔ ان دونوں سندھ بھر میں ووٹرلسٹوں کو سندھی زبان میں شایع کرنے اور ون یونٹ کے خاتمے کے سلسلے میں تحریک چل رہی تھی۔ اس تحریک کے تحت متعدد سیاسی اور طلبا رہنما سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے باہر بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان میں دیگر کے علاوہ کامریڈ غلام محمد لغاری اور لالا عبدالقادر قابل ذکر تھے۔ ان کی بھوک ہڑتال کو کچھ دن ہو گئے تھے۔ اس بھوک ہڑتال کی وجہ سے سندھ بھر میں عوامی ابھار میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک رات کو پولیس نے ایکشن کیا اور سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ جو باتیں شہر میں گشت کر رہی تھیں ان کے مطابق بھوک ہڑتالیوں کو گرفتار کرتے وقت ان پر لاٹھی چارج بھی کئی گئی جس کی وجہ سے کچھ کے سر خون میں نہا گئے۔

وہ دن بھی حیدرآباد کا ایک عجیب دن تھا۔ کالیجوں میں طلبا کلاس اٹینڈ کرنے کے بجائے ٹولیوں میں کالیجوں کے باہر کھڑے اس صورتحال پر بحث کرتے دیکھے گئے۔ ان کی چہرے سرخ تھے۔ ان میں غصہ بھی تھا تو خوف بھی تھا۔ خوف کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی تک سندھ میں انتظامیہ کے سامنے سر اٹھانے کی رسم بڑے پیمانے پر شروع نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کو اور خاص طور پر نوجوانوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ بس وہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو کیا کرنا چاہئے؟ یہ بات ان کو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ مگر شام ہوتے ہی یہ معمہ حل ہوگیا تھا۔ سارے شہر بلکہ سارے صوبے میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی کہ ایک ۱۸-۱۹ سالہ لڑکی اس سارے صورتحال کے خلاف ڈپٹی کمشنر حیدرآباد کے بنگلے کے مین گیٹ کے پاس بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئی ہے۔ لوگوں کو اس بات پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ لوگ جوک در جوک ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف روانہ ہوگئے۔ آدھے گھنٹے کے اندر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کے پاس سندھی نوجوان ایک بڑی تعداد میں جمع ہوگئے۔ اکثر نوجوان جذبات میں بھرے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ نوجوانوں نے والدین کو اطلاع کئے بغیر وہیں اپنے اس چھوٹی بہن کے ساتھ بھوک ہڑتال پر بیٹھنے کا اعلان کردیا۔ رات کو ہی کئی جواں اور ۱۹ سالہ یہ بچی گرفتار کرلی گئیں۔ ان نوجوانوں کی قیادت کرتے ہوئے جیل پہنچنے والی یہ بچی کوئی اور نہیں مگر ادی اختر بلوچ تھیں۔ ادی اختر بلوچ کے اس جرئتمندانہ عمل کی وجہ سے سندھ کے نوجوان مزید ابھر گئے ان میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ پھر یہ تحریک ایک روز چلی کہ حکومت کو نہ فقط ووٹرلسٹیں سندھی زبان میں شایع کرنے کا اعلان کرنا پڑا مگر عوام کا دباؤ اتنا بڑھا کہ

آگے چل کر خود دون یونٹ کو بھی ختم کرنا پڑا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ادی اختر بلوچ سندھ کی ممتاز سیاسی شخصیت رسول بخش پلیجو کی سوتیلی بیٹی ہیں، جس دن کامریڈ غلام محمد لغاری، لالا عبدالقادر کو گرفتار کر کے ظاہری طور پہ لسٹوں کی تحریک کو روک دیا گیا تھا اس وقت رسول بخش پلیجو بیمار تھے اور غالباً سول اسپتال جامشورو میں زیر علاج تھے۔ جب ان کو لغاری، لالا قادر و دیگر کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ شہر میں اپنے گھر آئے اور اپنی سوتیلی بیٹی کو ان کی رضامندی سے لاکر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کے سامنے بھوک ہڑتال پر بٹھا دیا۔

ادی اختر بلوچ نے ''**اُمیدِ سحر**'' میں رسول بخش پلیجو کا ذکر کیا ہے اور ان کا ذکر ''ادا'' کے حوالے سے کیا ہے۔ اس ڈائری میں ادی اختر بلوچ نے ان کے کچھ خطوط کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو ان کو رسول بخش پلیجو کی طرف سے جیل میں موصول ہوئے۔ ان خطوط کے ذریعے پلیجو صاحب، ادی اختر بلوچ کی سیاسی رہنمائی اور تربیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے ہی ایک خط میں، جو ڈائری میں رقم کیا گیا ہے، مسٹر رسول بخش پلیجو ادی اختر بلوچ کو مخاطب ہوتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''۔۔۔ زندگی میں ایسے کئی مواقع آتے ہیں جب انسان کو اپنی حیثیت کو بھول کر اکثر لوگوں جیسا چھوٹا، نامعلوم اور بے نشان بننا پڑتا ہے۔ مگر جب قومی، طبقاتی اور تاریخی مقاصد کی تقاضا ہوتی ہے تو آدمی خود ہی کئی گنا بڑا بن جائے اتنا بڑا جتنے کی تقاضا حالات کریں نہ فقط خود سے بڑا، مگر خود سے زیادہ دلیر، زیادہ بہادر، زیادہ جفاکش، زیادہ صابر، زیادہ شاکر اور زیادہ شاندار بنے۔ اس وقت یہ وقت آیا

ہے۔ خاص طور پر آپ کے لئے۔''

ایسے ہی ایک دوسرے خط میں جو بھی ڈائری میں شامل ہے، رسول بخش پلیجو لکھتے ہیں کہ ''۔۔۔ یہ نومبر اور رمضان کے دوران مہینہ ہے۔ یہ مہینہ گذشتہ دو سال سے ہمارے خاندان کے لئے آزمائش کا مہینہ بنا ہوا ہے۔ دو سال پہلے نومبر اور رمضان میں، میں جیل میں تھا۔ گذشتہ سال آپ نومبر اور رمضان کے دوران جیل میں تھیں۔ اس سال میں اور آپ کی والدہ شدید بیماری سے اٹھے ہیں۔ اس سال بھی ہم دونوں کی وہی حالت ہے۔ البتہ اس بار ہم اسپتال کے بجائے گھر میں ہیں۔ گذشتہ سال بھی ہمارے لئے عید کی خوشی نہیں تھی۔ اور اس بار بھی وہی اداسی اور وہی انتظار ہوگا۔ دو سال پہلے میں نے عید جیل میں کاٹی۔ گذشتہ سال آپ نے عید یونیورسٹی میں کی اور اس سال آپ جیل میں ہونگی۔''

''مگر اس مرحلے پر یہی سوچ آتی ہے کہ زندگی کی یہ نرالی، تلخ، بچھڑی ہوئی اور تنہا عیدیں وطن اور وطن کے لوگوں کے لئے کیسی ناپسندیدہ، میٹھی، خوشی سے بھری ہوئی عیدیں میسر کرنے کا باعث بنیں گی! ان اجنبی عیدوں نے ہمیں کیسا نہ اپنائیت، خودشناسی، شناسا ہونے اور شناخت کا سرمایہ فراہم کیا۔ ان عیدوں نے ہماری زندگیوں میں کیسے نہ نئے پن، انوکھے پن اور نرالے پن کو ناپنے کا حوصلہ فراہم کیا؟ ہماری زندگیاں کتنی بامعنی، بھرپور اور بامقصد بن گئی ہیں؟''

شاید یہ اس سیاسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ادی اختر بلوچ کو اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنا حوصلہ ملا کہ انہوں نے ایک مارشل لاء کو چیلنج کیا، اس وقت ایک ایسی سیاسی

جدوجہد کی قیادت کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، جو کہ بظاہر دم توڑ رہی تھی۔ اوران کی اس جرئت کی وجہ سے یہ تحریک کامیابی کی منزل تک پہنچی مگر اتنی چھوٹی عمر میں انہوں نے بار بار جیل یاترا کی اور فوجی عدالت میں فوجی افسروں کے سوالات کے بڑے حوصلے اور جرئت سے جواب دیے

دیکھا جائے تو ادی اختر بلوچ اس لحاظ سے بھی بہت خوشنصیب تھیں کہ ان کو جیجی زرینہ بلوچ جیسی ماں ملی، جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ سندھ کے فیوڈل معاشرے میں ایک ماں یہ سوچ کر ہی کانپ سکتی ہے کہ اس کی صغیر بیٹی ایک فوجی ڈکٹیٹر کے خلاف ایک سیاسی جنگ میں کود رہی ہے اور بعد میں وہ جیل میں قید ہوجاتی ہے۔ اس جیل میں اس کی بیٹی کی جان اور عزت کیسے سلامت ہوگی؟ مگر جیجی زرینہ بلوچ نے اپنی قیدی بیٹی کو جو خطوط لکھے ہیں جو اس ڈائری میں شامل ہیں، پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ فقط ایک ماں، ایک فنکارہ اور ایک سیاسی کارکن ہی نہیں تھیں مگر وہ ایک مکمل جنگجو تھیں۔ وہ اپنی قیدی بیٹی کو لکھے گئے خطوط کے ذریعے ایک جرنیل کی حیثیت میں اس جنگ میں حصہ لے رہی تھیں۔

ایسے ایک خط میں جیجی زرینہ بلوچ لکھتی ہیں کہ، ''امید ہے کہ آپ اپنے قول پر مستحکم رہیں گی، زندگی نام ہی تکلیف کا ہے۔ جب آپ ان تکالیف کو پار کرلینگی تب آپ کو انسانوں کی قدر ہوگی اور احساس ہوگا کہ بیچارے لوگ کتنے دکھ اور تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ آپ نے یہ تکالیف اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے خوشی سے قبول کی ہیں۔ لہٰذا آپ کو چاہئے کہ ہنستے کھیلتے آپ ان تکالیف کو پار کریں۔''

ایک اور خط میں جیجی زرینہ بلوچ اپنی قیدی بیٹی کو لکھتی ہیں کہ ''۔۔۔زندگی اور موت قدرت کے بس میں ہیں اگر آپ مر بھی گئیں تو کیا ہوا؟ امر ہو جائینگی۔ روزانہ سینکڑوں اور لاکھوں لوگ بے مقصد موت مرتے ہیں۔ کیا آپ کو گھر میں بھی موت نہیں آ سکتی؟۔۔۔''

ایک خط میں جیجی زرینہ بلوچ جیل میں قید اپنی بیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتی ہیں کہ،''۔۔۔میں تجھ پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ مجھے فقط تیری صحت کا فکر ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ تم تو پھنس گئی ہو۔ مگر ساتھ ہی سوچتی ہوں کہ فلسطینی لیلیٰ خالد کی بھی تو ماں تھی۔ لاکھوں ویتنامیوں کی بھی مائیں تھیں۔ قرت العین طاہرہ کی بھی ماں تھی۔ عظیم وہ قوم ہے جس کی عورتیں اور مرد بہادر ہیں۔ ایسی قوم ہمیشہ زندہ رہے گی، کبھی کسی کی غلام نہیں بنے گی۔ یہ تو جیل کی سزا ہے۔ اگر تجھے پھانسی دیں تب بھی ہم نہیں ہلینگے۔ ایک دن تو ویسے بھی مر ہی جانا ہے۔ بستر پر مرنے سے میدان جنگ میں مرنا ہزار ہا بار بہتر ہے۔۔۔ میری ہر دم تمہارے لئے بہادری، سچائی اور جرئت سے ڈٹ جانے کے لئے دعائیں ہیں۔ خدا تجھے اپنے عظیم مقصد میں کامیاب کریگا۔ تو کسی کی غلام نہ ہوگی۔ تو تو میری ایک بیٹی ہے۔ اگر میری ایک سو بیٹیاں ہوتیں تو میں سندھ کی قسم سب کو سندھ دیس کی دھرتی پر قربان کر دیتی۔''

ایک اور خط میں جیجی اپنی اسیر بیٹی کو مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ''۔۔۔وقت اور حالات کے مطابق جو بھی سفر ہوا صحیح ہوا۔ شاہ لطیف کہتے ہیں کہ 'دولہے اور گھوڑے چند دن ہی زندہ رہتے ہیں۔ وہ کبھی قید میں ہوتے ہیں تو کبھی بیابان کو روندتے

ہوئے نظر آتے ہیں۔تو میری بیٹی! یہ تو فقط ریل کا سفر تھا۔ وہ بھی فقط پانچ گھنٹوں کا بس! سر چارلس نیپئر نے جب اپنی قوم کی طرف سے سندھ کو فتح کیا تو کسی کام کے لئے اسے شکار پور سے لاہور جانا پڑا۔ یہ فاصلہ اس نے تین ماہ تک سفر کر کے طئہ کیا۔ اس نے یہ سفر گھوڑے پر کیا۔اس کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہوگی۔اس دور میں اور آج کے دور میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔''

ایک اور خط میں جیجی زرینہ کہتی ہیں کہ''۔۔۔ میں کچھ عورتوں سے ملی۔ وہ سب تجھے ''بیچاری'' کہہ کر یاد کر رہیں تھیں۔مگر انہیں یہ پتہ نہیں کہ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں۔ ہمارے بلوچ خاندان میں مائیں اپنی اولاد کو، جو ابھی بہت چھوٹے ہوتے ہیں، کو مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہیں کہ میرے چاند! میرے لال! تو جلد سے جلد بڑا ہو جا کیونکہ تجھے اپنے باپ کا بدلہ لینا ہے۔'' ویتنام کی مائیں بھی کہتی ہیں کہ ''بیٹا سو جا! ابھی تیری نیند کا وقت ہے۔ کیونکہ تجھے بڑا ہو کر راتیں جاگ کر گذارنی ہیں! اپنے وطن کے لئے جنگ کرنی ہے۔''

ادی اختر بلوچ 'قیدی کی ڈائری'' میں ایک جگہ لکھتی ہیں کہ ''صبح کو تقریباً پانچ بجے حیدر آباد پہنچے۔ حیدر آباد کی اسٹیشن سے کم از کم آدھے میل کا راستہ پیدل چلا کہ یہ لوگ ہمیں تھانے لے آئے۔ میرے ہاتھ میں بیگ تھا۔ لہٰذا مجھے پیدل چلتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ تھانے سے ہمیں پولیس گاڑی میں جیل لے آئے۔ یہاں آ کے مجھے سینے میں درد ہونے لگا اور بخار بھی شروع ہو گیا۔ گلہ تو پہلے ہی بلکل خراب تھا۔ ایک تو ٹرین میں سردی لگی۔ بعد میں اسٹیشن سے پیدل تھانے تک آتے

اور سردی لگی۔ لہٰذا میں بلکل نڈھال ہوگئی۔ ڈاکٹر کو اطلاع دی گئی۔ اس نے انجیکشن دی۔ آج انگلش کا پیپر تھا۔ مگر میں امتحان دینے کے بلکل قابل نہ تھی۔''

یہ احوال جب ان کے گھر پہنچا تو رسول بخش پلیجو نے اپنی بیٹی کو خط لکھا، جس میں کہا گیا کہ ''خط ملا۔ احوال پڑھ کے بہت غصہ آیا۔ تجھے امتحان دینے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تم اس بیماری کی حالت میں کیا امتحان دیتیں؟ تو لکھ کر دے کہ تو بیمار ہے۔ ساتھ ہی جس طرح تجھے سفر کرایا گیا ہے اس نے تجھے بلکل بیمار کر دیا ہے۔ امتحان ہرگز نہ دینا۔ چاہے تجھے واپس بھیج دیں۔ آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔

تیز اسخت بیماری کی حالت میں بھی مسلسل جیل میں رہنا اور معافی نہ مانگنا۔ اس نے اپنی قوم کا حوصلہ بلند کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ جھوٹے روٹی توڑ مجنوں کون ہیں؟ اور بہادر سرفروش کون ہیں؟ اس کا فرق ان باتوں سے ہی معلوم ہوگا۔

ہمیں تو ہر پل یاد ہے۔ ہر وقت یاد ہے۔ مگر ہمیں خوشی ہے کہ تم میدان میں ہے۔''

'' اُمیدِ سحر '' میں پیش کئے گئے، ان خطوط سے یہ اقتصادیات اس پیش لفظ میں شایع کرنے کا مقصد اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں سندھ کی ۶۰-۷۰ء کی دہائی کے دوران مخصوص فیوڈلسٹ معاشرے کا ایک فرد ہوتے ہوئے ادی اختر بلوچ کے خلاف مارشل لاء حکومت کو چیلنج کرنے، راستون پر آ کر بار بار سندھ کے اشوز پر بھوک ہڑتال کرتے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے، فوجی عدالت میں فوجی افسراں سے بہادری سے مخاطب ہونے اور چھوٹی سی عمر میں ایک بہادر اور کمیٹیڈ سیاسی کارکن کے طور پر سندھ کے سیاسی منظر پر

ابھرنے کے کیا محرکات تھے؟ ظاہر ہے اس صورتحال کا محرک رسول بخش پلیجو، اس کے نظریات اور اس تربیت کے محرکات تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پلیجو نے فقط اپنے گھر کے ایک فرد اختر بلوچ کو ہی متاثر نہیں کیا، اپنی پارٹی کے ممبران اور کارکناں کو ہی متاثر نہیں کیا مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے سندھ کی ایک نسل کو انسپائر کیا ہے۔ سیاسی جدوجہد کے دوران سندھ کے عوام نے اگر کچھ کامیابیاں حاصل کی ہیں تو ان کے پیچھے جو بھی عناصر کارفرما تھے۔ ان میں رسول بخش پلیجو کے نظریات اور اس کی پارٹی کی سیاسی جدوجہد نمایاں طور پر شامل ہے، جب بھی کوئی مورخ سندھ کی سیاسی تاریخ قلمبند کریگا تو اسے شاید رسول بخش پلیجو، پلیجو ہاؤس اور عوامی تحریک کے بارے میں ایک ایک جامع باب رقم کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں اس ڈائری کو اردو میں بہت پہلے شایع ہو جانا چاہئے تھا۔ بہرحال، دیر آید درست آید۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے، خود سندھیوں کی ناکامی ہے یا سندھ اور پاکستان میں رہنے والے دیگر لوگوں کے غیر ذمہ داری ہے کہ آج بھی سندھ، اس کی تاریخ، سندھ کو درپیش اشوز پر سندھ کی سیاسی جماعتوں اور سندھ کے عوام کے موقف کے بارے میں معلومات نا ہونے کے برابر ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستان میں رہنے والے دیگر لوگوں اور حلقوں کے لئے سندھ آج بھی مکمل طور پر اندھیروں میں ہے۔ آج اگر سندھی کالا باغ ڈیم کے خلاف ہیں تو کیوں ہیں؟ کیا وہ اس کی اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ سندھ ہر قسم کی ترقی کے خلاف ہے؟ یا سندھ کے بڑے جائز خدشات، ماضی میں سندھ سے ہونے والی زیادتیاں ہی اصل سبب ہیں اس مخالفت کا؟ سندھ والے کھوکھراپار بارڈر کھولنے کے مخالف کیوں

ہیں؟ کیا وہ اس کی اس وجہ سے مخالف ہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات معمول پر لانے کے خلاف ہیں؟ یا سندھ اس وجہ سے مخالف ہے کہ ماضی میں ان بارڈرز ہی سے آنے والے لوگوں نے سندھ کے اندر سندھی عوام کے وجود کو غیر یقینی بنادیا ہے؟ اس طرح سندھ کے بارے میں وسیع حلقوں میں آج بھی یہ تاثر ہے کہ ساری سندھ وڈیرہ شاہی کے ساتھ ہے۔ سندھ میں تو کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب ''کاروکاری'' کے ذریعے عورتوں کے ساتھ مظالم نہیں کئے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ پاکستان کے دیگر لوگوں اور حلقوں میں سندھ کا جو چہرہ paint کیا گیا ہے وہ مکمل طور پر Dark اور نیگیٹو ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سندھ میں وڈیرا شاہی کے خلاف سندھ کے عوام نے مسلسل بغاوت کی ہے۔ ایسی جو بھی تحریکیں چلیں۔ ان میں سے ایک تحریک کی قیادت ایک ہاری عورت بختاور نے کی۔ اس کا ذکر کیوں نہیں کیا جاتا؟ پاکستان میں اینٹی ون یونٹ تحریک کی قیادت سندھیوں نے کی ۱۹۳۸ء میں ''پاکستان بچاؤ'' تحریک سندھ نے شروع کی۔ جس کی وجہ سے سندھ کی مظلوم عوام پر مظالم ٹوٹ پڑے۔ اسی تحریک اور ایسی دیگر تحریکوں کا حصہ ادی اختر بلوچ بھی تھیں۔ اختر بلوچ واحد سندھی لڑکی نہیں تھیں جنہوں نے اس دور میں بھوک ہڑتال کی اور جیل یاترا کی۔ مگر اور بھی سندھی لڑکیوں نے بے جگری سے ان تحریکوں میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ووٹرلسٹوں کو سندھی زبان میں شایع کرنے کے سلسلے میں شروع کی گئی تحریک کے دوران ادی اختر بلوچ کے علاوہ ادی رضیہ میمن بھی ان دنوں جیل میں گئیں۔ اس طرح ہمارے حقوق کے لئے جدوجہد کی پاداش میں ادی اختر بلوچ کے ساتھ ادی نسیم سندھی بھی مسلسل جیل میں رہیں، مگر ایک پل کے

لئے بھی کمزور نہیں ہوئیں اور معافی نہیں مانگی۔ لہٰذا بہت ضروری ہے کہ یہ کتاب اردو میں شایع ہو اور اسی طرح دیگر کتاب بھی اردو اور انگریزی میں شایع ہوں، اور کم سے کم پاکستان کے دیگر لوگوں اور طلباء کے سامنے ایسے دستاویز ضرور موجود ہوں، جن سے یہ بات عیاں ہو کہ سندھی قروں وسطیٰ کی بے جان قوم نہیں ہے۔ مگر یہ تو جاندار بہادر، مسلسل سیاسی جدوجہد کرنے والے مرد اور خواتیں سیاسی گارڈز اور کارکنوں کی قوم ہے جسے شکست نہیں دی جاسکتی۔ سندھ کی قوم بے پناہ مشکلات کے باوجود بتدریج قدم بہ قدم ایک ایسی منزل تک مارچ کر رہی ہے جہاں پہنچنے کے بعد سب کو سندھیوں کو ایک زندہ اور آزاد منش اور رشتوں کے لئے بے پناہ قربانیاں دینے والی قوم کی حیثیت میں تسلیم کرنا پڑے گا۔ سندھی بنیادی طور پہ پرامن اور کلچرڈ ہیں، سندھی چرواہوں کی نہیں شاعروں، فنکاروں، سیاسی جنگ لڑنے والے مجاہدوں اور انسان دوست افراد کی ایک زندہ قوم ہے۔ اس قوم کے پاس شاہ عبداللطیف بھٹائی کا پیغام ہے جو ساری انسان ذات کیلیئے ہے۔ وہ وقت آئیگا جب نہ فقط پاکستان، نہ فقط یہ خطہ مگر اس ساری دنیا کے لوگ سندھی قوم کی ان خوبیوں اور انسانیت سے بے پناہ وابستگی سے روشناس ہونگے۔ لہٰذا وہ وقت آئیگا جب سندھ دنیا کی روشن خیال قوموں کی پہلی صف میں ہوگے اور سندھ ساری دنیا کے روشن خیال اور انسان دوست افراد کی قیادت کریگا۔ سندھ کو یہ کردار ادا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

جی۔ این مغل

ٹنڈو الہ یار

۲۴۔۳۔۲۰۰۶ع

مجھے آج بھی ۱۹۶۹ء کا جاڑا یاد ہے، جب سندھ کے طلبہ، ادیب، شاعر، دانشور، سیاسی اور قومی رہنما اپنی زبان، ون یونٹ اور سندھ کے دیگر حقوق کیلئے جلسِ، جلوس اور بھوک ہڑتالیں کر رہے تھے۔ سب کو گرفتار کر کے جیل بھر دیے گئے اور تحریک جیسے رُک گئی۔ ادا رسول بخش (رسول بخش پلیجو) اور اماں جیجی زرینہ بلوچ بھی اس جدوجہد میں اگلی صف میں شامل تھے۔ ادا نے اپنی عملی سیاست کے ذریعے اور اماں نے شیخ ایاز کے انقلابی گیت گا کر سندھ کے لوگوں میں بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی کاوشیں کیں۔

نومبر ۱۹۶۹ کی وہ سرد شام آج بھی میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی ہے، جب سب سیاسی لیڈروں اور طلبہ کی گرفتاری کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ ادا رسول بخش اور اماں دونوں جامشورو اسپتال میں زیرِ علاج تھے اور میں ان کی تیمارداری میں مصروف تھی، تو ادا اس سیاسی صورتحال پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اب کیا ہوگا؟ میں بھی یہ سن کر پریشان تھی۔ اچانک پتہ نہیں مجھے کیسے خیال آیا اور میں نے ادا سے کہا

کہ "میں بھوک ہڑتال پر بیٹھوں؟" ادا یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش ہو گئے اور پھر کہنے لگے کہ تجھ میں ہمت ہے؟ جیل جانا پڑا تو جا سکو گی؟ لیکن اگر ایسا ہو تو نہ فقط سندھ، بلکہ پورے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا۔ ابھی تک کسی لڑکی نے یہ ہمت نہیں کی ہے۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا کہ میں تم کو نہیں روکوں گی، اگر تم میں ہمت ہو۔ میں اسی وقت گھر روانہ ہوئی، دو بینر لکھے اور ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کے آگے بینر لگا کر بیٹھ گئی۔ اس لمحہ سندھ کی قومی جدوجہد کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا کہ سندھی عورت اتنی باہمت اور بہادر ہے کہ وہ اپنے حقوق کیلئے اپنے بھائیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہے۔

جب دوسری مرتبہ بھوک ہڑتال کی تو نسیم سندھی بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ مجھ سے بھی چھوٹی تھی، لیکن ہمت اور جذبہ بہت تھا۔ ہمیں دوسرے کچھ طلبہ کے ساتھ فوجی عدالت نے ایک سال کی سزا سنا کر سکھر جیل بھجوا دیا، کیونکہ وہ عورتوں کا پکا جیل تھا۔ سزا یافتہ خواتین کو

.اس میں رہنا پڑتا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ میں نے اتنی بڑی تعداد میں سندھ کی دیہاتی عورتوں کو مختلف مقدمات میں سزائیں کاٹتے ہوئے دیکھا۔ ان کی آپ بیتیاں سن کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ کتنی معصوم اور بے گناہ ہیں، جو کہ جاگیر دارانہ معاشرے کے گندے رسم ورواج، مردوں کی بے وفائی اور اپنے انجانے پن کی وجہ سے یہاں سزا کاٹ رہی ہیں۔ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رتنی، دادلی، قائماں اور باقی عورتوں کے چہرے گھوم رہے ہیں۔ جیل کے عملے کی ان کے ساتھ بے انصافیاں، ان کو اس طرح بے عزت کیا جاتا تھا اور مارا پیٹا جاتا تھا، جیسے وہ ان کی گناہگار ہوں۔ ان کے گھر والوں کا ان سے سالوں سے نہ ملنا اور ان کو بلکل بھلا دینا۔ میں سوچتی تھی کاش میں ان کے درد کا کچھ مداوا کر سکوں۔

جیسا کہ ہمارے گھر کا ماحول ادبی اور سیاسی تھا، اس لئے کافی ترقی پسند ادب پڑھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ میں نے روس، چین اور ویتنام کے انقلابوں کی کہانیاں پڑھی تھیں اور وہاں کی عورتوں کی بہادری کے قصے

پڑھے تھے۔ میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ جیسے ان ممالک میں انقلاب آئے ہیں اور وہاں کی عورتوں کی قسمت بدلی ہے، فرسودہ رسم ورواج اور جاگیر دادرانہ نظام میں دراڑیں پڑی ہیں تو اسی طرح کچھ سالوں میں یہاں بھی تبدیلی آئے گی اور ہماری عورت بھی چین کا سانس لے سکے گی، مگر افسوس آج ۴۰ سال گذرنے کے باوجود سندھ اور سندھی عورت کی حالت دن بدن خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ جاگیرداری اور سرداری نظام زیادہ مضبوط ہوتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے عورت کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں۔ ہر روز کتنی معصوم عورتیں کاروکاری کے نام پر جانوروں کی طرح ذبح کردی جاتی ہیں اور مجرم سزا سے بچ کر آزاد گھوم رہے ہوتے ہیں اور پھر دوسری زندگی ختم کرنے کی تیاری کرتے ہیں اور جیلوں میں قید عورتوں کی حالت بھی پہلے سے بہت زیادہ خراب ہے۔ اُن پر تشدد کیا جاتا ہے اور انہیں کوئی سہولت میسر نہیں۔

۱۹۷۲ میں ۲۰ سال کی عمر میں اماں نے میری شادی غلام قادر پلیجو سے کرائی۔ انہی دنوں میں لسانی فسادات شروع ہوگئے۔ ہم اس وقت

لطیف آباد میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر پر بھی حملہ ہوا، اس لئے سب وہاں سے شفٹ ہوگئے۔ میں اور غلام قادر ان کے گاؤں جنگشاہی آگئے، جہاں سے میری زندگی کا ایک اور نیا اور نرالا دور شروع ہوا۔ جیسا کہ میں ہمیشہ شہر میں رہی، پلی بڑھی تھی، مجھے دیہات کے رہن سہن کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر جیل میں جانے والی پہلی لڑکی تھی، اس لئے ایک خاص لڑکی بن گئی۔ سندھ کے لوگوں نے مجھے "سندھ کی سورمی" کا لقب دیا۔ ہر وقت سیاسی جلسے جلوس، تقریریں کرنا، کتابیں پڑھنا، ہر وقت مصروف رہتی تھی۔ اب مجھے ایک خالص دیہاتی زندگی سے واسطہ پڑا۔ اس وقت جنگ شاہی میں بجلی بھی نہیں تھی اور نہ پانی تھا۔ رہن سہن اور زبان میں بھی فرق تھا۔ ان سب مسائل کے علاوہ ایک بات تھی کہ میری اور میرے شوہر کی سوچ ملتی جلتی تھی۔ ہم دونوں ترقی پسند اور انقلابی سوچ رکھنے والے تھے، دونوں چاہتے تھے کہ اس معاشرے کو تبدیل کرنے کیلئے ہم کچھ کر سکیں۔ یہی مشترکہ سوچ میرا جنگشاہی میں رہنے کا سبب بنی۔ دورا چیلنج قبول کرنا میری طبیعت میں

شامل تھا۔ میں نے اس نئی زندگی کو بھی چیلنج کے طور پر لیا۔ کبھی کبھی اتنی تنگ بھی ہو جاتی تھی کہ دل کہتا تھا کہ بھاگ کر حیدرآباد چلی جاؤں، لیکن پھر دل میں کہتی کہ ہمت نہیں ہارنی۔ پھر رات کو جب لالٹین کی دھندلی روشنی میں، میں اور غلام قادر اکٹھے کبھی دوستووسکی کا ناول "ذلتوں کے مارے ہوگئے لوگ"، کبھی میکسم گورکی کا "ماں" تو کبھی روس کے انقلاب پر لکھے گئے ناول "دار لرس کی آزمائش" تو کبھی چینی انقلابی ناول "نوجوانوں کا گیت" یا "پہاڑوں کی بیٹی" پڑھتے تھے اور پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی تھی۔ صبح کو جاگنے کے بعد پھر میرے اندر حوصلہ پیدا ہو جاتا اور میں اپنے آپ سے کہتی تھی کہ مجھے یہاں رہنا ہے اور یہاں کی زندگی کا حصہ بننا ہے۔

جیسا کہ جنگشاہی ایک کوہستانی علاقہ ہے، جہاں پر پانی نہ ہونے کی وجہ سے ہریالی بالکل نہیں ہے اور ریت اڑتی رہتی ہے، پانی کنویں سے آتا تھا، عجیب ذائقہ ہوتا تھا۔ اگر ساون کی بارش ہوتی تھی تو یہ سارا علاقہ کوہ مری سے زیادہ خوبصورت اور سرسبز ہو جاتا۔ آس پاس کے علاقوں

سے لوگ آتے تھے، خوب رونق لگتی تھی۔ لوگ بارش کے فصل اگاتے تھے، جس میں تِل، تربوز، ٹماٹر اور دوسری سبزیاں شامل ہوتی تھیں۔اس موسم میں مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے وہاں گاؤں کے لوگوں کی خوشی اور غمی کے موقعو میں شرکت کرنی شروع کردی، اس لئے مجھے وہاں کی عورتوں کے مسائل، دکھ سکھ، مجبوریاں، ہمت، بہادری اور پیار کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کا موقعہ ملیا۔ میری سسرال کی فیملی کے علاوہ باقی سب گھروں کی عورتوں کی زندگی ایک عام دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتی تھی، جس میں عورت مکمل طور پر مرد کی محتاج اور تابع تھی۔

وہاں پر رہنے اور ان لوگوں کے مسائل اور دکھ سکھ دیکھنے کے باعث میری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور مجھے پتہ چلا کہ اصلی مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان کا حل نکالنا کتنا ضروری ہے۔ سب سے اہم مسئلا پانی کی شدید قلت کا تھا۔ مقامی عورتیں سارا دن گاگریں اور برتن سر پر اٹھا کر پانی کیلئے بھاگ دوڑ کرتی تھیں۔ گرمیوں میں کنوؤں کا

پانی سوکھ جاتا تھا۔ آدھی رات کے بعد پھر تھوڑا سا پانی آتا تھا، تب بیچاری عورتیں ساری رات جاگ کر کنوؤں سے پانی بھر بھر کر لاتی تھیں۔ آج تک وہاں پر پانی وہی مسئلا ہے اور اب بھی وہاں کے لوگ پانی کیلئے ترستے ہیں۔

میرے بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت جنگشاہی میں ہی ہوئی، خاص کر کے دونوں بڑی بیٹیوں سسئی اور بختاور نے اپنی پرائمری تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ اسی وجہ سے ان میں عام انسانوں کے دکھ سکھ کو سمجھنے کا شعور ملا اور سندھ کے لوگوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد کے بارے میں پتہ چلا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے بچوں کو بچپن سے ہی سندھی، ترقی پسند اور بین الاقوامی ادب، خاص طور پر چینی، روسی اور ویتنامی انقلابی ادب اور تاریخ سے روشناس کروایا، جس کی وجہ سے وہ دنیا کے ساتھ جڑے اور ان کی سوچ وسیع ہوئی۔

میرے پانچوں بچے سسئی، بختاور، پرہ، سرمد اور اسد نہ صرف اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں، بلکہ پوری سندھ کے مظلوم عوام کیلئے

اپنے دل میں درد رکھتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اپنی زبان، تہذیب، سندھ اور سندھ کے لوگوں کیلئے کوئی بھی قربانی دینے میں دریغ نہیں کریں گے۔ میری بیٹی سسئی اس کا ایک مثال ہے، جو کہ اپنے بس کے مطابق اسمبلی اور اسمبلی سے باہر بھی سندھ کے مسائل پر آواز اٹھاتی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر اس کو موقعہ ملا تو وہ آگے جا کر سندھ کے لوگوں کیلئے اور بھی بہت کچھ کرے گی۔

مجھے اس بات کی خوشی اور امید ہے کہ جو جدوجہد ہمارے بڑوں اور ہم نے اپنی زندگی میں کی، اس کا تسلسل ختم نہیں ہوگا اور نہ صرف ہمارے خاندان کے بچے، بلکہ سندھ کی نئی نسل بھی اپنی ذمہ داری محسوس کرے گی۔ جب تک سندھیوں کو عزت کے ساتھ جینے کا حق دیا جائے گا، تب تک جدوجہد جاری رہے گی۔ بس یہ دکھ ہے کہ ابھی تک ہماری دھرتی اور اس کے لوگوں کو سکھ کا سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن امید اب بھی ہے۔

اختر بلوچ

سینٹرل جیل، حیدرآباد

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۲۵-۷-۷۰

رات دس بجے

آج دوپہر ہمیں سینٹرل جیل لایا گیا، تقریباً ایک بجے ہمیں چاوڑی پولیس تھانہ سے باہر لایا گیا۔ ہمارے ساتھ پانچ طالب علم بھائی بھی تھے۔ مجھے ۱۹ نومبر ۱۹۶۹ء کی وہ شب یاد ہے، جب الیکشنی فہرستیں سندھی میں چھپنے اور ون یونٹ توڑنے کیلئے میں پہلی بار بھوک ہڑتال پر بیٹھی تھی۔ اس دوران میں نے کیا محسوس کیا وہ میں تحریر نہیں کرسکتی۔ مگر انتہائی جوش اور خوشی کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا خوف بھی تھا کہ ''خدا جانے جیل کیسی ہوتی ہے؟ قیدیوں کے ساتھ رکھیں گے یا علحدہ؟ آخر کیا ہوگا؟'' مگر آج جب میں جیل لائی جارہی تھی تو کوئی خوف، وہم یا وسوسہ نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے گھر جارہی ہوں۔ انسپیکٹر ہمیں جیل کے دروازے پر کھڑا کر کے خود اندر چلا گیا۔ اب ہمارے لئے لمحہ بھی جیسے ایک گھنٹے کے برابر تھا۔ خواہش تھی کہ جلدی اندر جائیں۔ آخر ہمیں مخاطب کر کے کہا گیا۔ ''جلدی کرو اندر چلو''، ہم سب اندر داخل ہوگئے۔ ہمارے ہمراہ ایک سکھ عورت بھی تھی۔ میٹرن ہمیں اندر لے گئی۔ زنانہ وارڈ کا دروازہ کھولا تو سامنے آپا فاروق پر نظر پڑی۔ ایک

لمحے کیلئے انتہائی خوشی ہوئی کہ چلو ہم تنہا نہ ہوں گے۔ مگر جب آپا بھاگ کر مجھ سے بغلگیر ہوئی تو مجھے ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء کے وسط تک کا سارا عرصہ یاد آ گیا۔ میں نے آپا سے کہا ''آپ ابھی تک یہیں ہیں؟'' اور پھر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں نے دیکھا کہ آپا بھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

آپا فاروق اپنے شوہر کے قتل کیس میں آئی ہیں۔ ان کا کیس جرگے میں چل رہا ہے۔ انہیں اب یہ تیسرا سال ہونے کو ہے اور ابھی تک ان کی تاریخ نہیں پڑی۔ آپا پٹھان ہیں۔ انہون نے جس طرح ہماری خدمت کی اور خیال رکھا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ آپا نے مجھ سے کہا ''اختر میری تاریخ نہیں پڑ رہی۔ اور جب میں جیل حکام سے کہتی ہوں تو وہ تہمتیں لگا کر میرا منہ بند کر دیتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ میرا کیس جرگے میں ہے اور جرگہ تو ایک بے انصاف عدالت ہے، جس سے عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن اب میں سوچتی ہوں کیا پتہ سزا ہوگی یا آزاد ہو جاؤں گی، اس امید نے مار دیا ہے۔ سزا دے دی جائے تو انسان دل مضبوط کر کے وقت گذار لیتا ہے۔''

پھر میری نظر معصوم چھلڑو اور اس کی ماں اور پھوپھی پر پڑی میں نے پوچھا ''کیا ابھی تک آپ کے مقدمات بھی نہیں نمٹے؟'' وہ کہنے لگیں ''ایک مقدمے کا فیصلہ ہوگیا ہے، ابھی دو رہتے ہیں۔'' یہ دونوں یہاں چوری کے دو تیں مقدمے میں قید ہیں۔ چھلڑو اب اچھا خاصہ بڑا ہوگیا ہے، سارا دن دانت نکالے بولتا رہتا ہے۔ پہلی بھوک ہڑتال میں جب مجھے تنہا رکھا گیا تھا، تب چھلڑو میرا تنہا ساتھی تھا۔ اس

دوران اس کے صرف دو دانت تھے اور بڑی اٹھکیلیاں کرتا رہتا تھا۔ بیچارہ ماں کے ساتھ خود بھی سزا کاٹ رہا ہے۔ اب اس کا ایک اور دوست بھی آ گیا ہے، نام ہے اس کا احمد شیر۔ وہ ماں اور باپ کے ساتھ قتل کے جرم میں اندر ہے۔

ہاتھ منہ دھو کر میں نے جیل کی فضا پر غور شروع کر دیا۔ وہی دھوئیں سے کالی ہو چکی سڑک اور کوٹھی، وہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، وہی ٹوٹا دروازہ اور وہی میدان۔ ہماری چارپائی گرمی کی وجہ سے اسی املی کے درخت کے نیچے پڑی ہے اور سامنے وہی کیکر اور املی کا اکیلا درخت ہے۔ دل میں سوچتی تھی کہ ان عورتوں کا وقت کیسے کٹتا ہوگا؟ ہمارے سامنے تو عظیم مقاصد ہیں۔ تبھی ہمت بندھی ہوئی ہے مگر ویران کھنڈر میں یہ بیچاریاں کیا کرتی ہوں گی؟ یہ غریب دل بہلانے کیلئے سارا دن بولتی رہتی ہیں۔ ایک میٹرن کو دوسری کی چغلیاں لگاتی رہتی ہیں۔ بس وقت ہی کاٹ رہی ہیں۔

ابھی ابھی رات کے ساڑھے دس بجے کا الارم بجا ہے۔ اور اب ان سب حفاظتی چوکیوں سے آوازیں گونجیں گی۔ ہماری ضعیف میٹرن اماں منہ کھول کر تھڑے پر ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتی ہوئی سو رہی ہے۔ سوچتی ہوں کہ اگر میں بھی ایسی کھلی فضا میں سو سکوں تو کتنا سکون ملے! ادھر اندر کتنا حبس اور گرمی ہے۔ آپا فاروق ابھی ابھی خط لکھ کر سوئی ہیں، دوسری سب سو چکی ہیں۔ سکھ عورت جھولے نما چارپائی کے اندر مسلسل کروٹیں لیتی اور کھانستی ہوئی بے چین ہو رہی ہے۔ مجھے اور نسیم کو ایک چارپائی ملی ہے۔ جب میں سونے کی تیاری میں ہوتی ہوں تب تک نسیم

مزے سے ساری چار پائی گھیر کر گہری نیند سو رہی ہوتی ہے۔

آج ہماری بھوک ہڑتال کی دوسری رات ہے۔کل رات ہم اس وقت تک گرفتار نہیں ہوئی تھیں۔ جئے سندھ چوک پر انتظار کر رہیں تھیں کہ کب آ کر لے جاتے ہیں۔ باہر سے زوردار آواز گونجی ہے، شاید جیلر ہو۔ سپاہی نے چونک کر اپنے الرٹ ہونے کا ثبوت دیا ہوگا۔ بیچارے!اپنے پیٹ کی خاطر خود اپنے جیسوں پر کیسے پہرے دیتے ہیں۔ ہمدردی کے مستحق صرف قیدی ہی نہیں، یہ سپاہی بھی ہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے اور ساتھ ہی بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔دل تو چاہتا ہے کہ چائے پیوں مگر آگ بجھ چکی ہے۔ پتہ نہیں کب رات کٹے گی۔سوچ رہی ہوں کہ حالات کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ابھی گذشتہ تین دن پہلے بیس دن زیارت اور کوئٹہ گھوم کر ریل گاڑی میں واپس آئے تھے۔میں یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب سارے کام چھوڑ کر امتحانات کی تیاری کروں گی۔وہم وگمان میں بھی نہ تھا، کہ میں یہاں بیٹھی ہوں گی۔

۲۶-۷-۷۰

رات کے گیارہ بجے

تھوڑی دیر پہلے آپا فاروق نے بہت گانے سنائے، زینب اونظیراں نے پنجابی ٹپے اور ماہیے سنائے۔ مجھ سے اور تو سب بھول گئے ہیں صرف دو لائنیں یاد ہیں ''نکا نکا باجرا تے وٹا ماریا کاواں نوں' دھیاں پردیساں جھورا لگیا ماواں نوں!'' اسے بکھو نے گایا تھا۔ آواز بے حد خوبصورت تھی اور مجھے گانے کا انداز بھی بہت پسند آیا۔ زینت صدیقی کا گایا گیت ''اماں! تم نے ایسی بیٹیوں کو کیوں جنم دیا؟ بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے اماں!'' ''چھوتھے جنی اہڑیوں دھیئر وھس اماں؟ دھیئر پرایو دھس اتھی ڑی اماں۔ یاد آ گیا۔ سوچنے لگی کہ قدرت کا قانون کتنا عجیب ہے۔ والدیں بیٹیاں پال پوس کر غیروں کو دے دیتے ہیں اور بیٹی سے ہمیشہ آس امید ختم کر دیتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے ہاں سندھ میں تو بیٹی کو قربانی کا بکرا سمجھ کر جسے چاہیں اسی کے ساتھ رخصت کر دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اسے بالکل گھر میں بٹھا دیتے ہیں۔ کسی کا حق بخشواتے ہیں اور کسی کی قرآن کے ساتھ شادی کر دیتے ہیں۔ ہمارے میروں، پیروں، وڈیروں، سیدوں کا یہ حال ہے کہ خود جائز ناجائز کئی شادیاں کرتے ہیں اور صرف بیٹیوں اور بہنوں کیلئے شادیاں گناہ تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، کیسے کریں؟ عزت گھٹ جائے گی! مجھے اپنی ایک سہیلی یاد آئی، وہ آپس میں سات بہنیں ہیں۔ چھ جوان ہیں، اچھا خاصا پڑھا لکھا گھرانہ ہے۔ ہر اعتبار سے ترقی پسند، اچھا خاصا سرمایہ دار کنبہ ہے لیکن ابھی تک کسی کی بھی شادی

نہیں ہو پا رہی۔ بڑی دو بہنیں تو کافی بڑی عمر کی ہوگئی ہیں۔ شروع میں جب بھی کوئی رشتہ آتا، اسے صاف جواب ملتا۔ ''ہم بیٹیاں دیں گے کیا؟ خدا کا دیا سب کچھ ہے، پڑھیں، گھومیں، کھائیں!'' آخر لڑکیوں نے بہت انتظار کیا اور پھر احتجاج شروع ہوگیا، رشتہ داروں نے کہنا شروع کر دیا کہ رشتہ لینے جاؤ تو بڑی بے رخی سے پیش آتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ اس وجہ سے کسی نے بھی یہ خطرہ مول لینا گوارہ نہ کیا۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا ''سناؤ بھئی؟ سنا ہے تمہاری شادی ہونے والی ہے؟'' بیچاری کی آنکھوں میں آنسوں تیرنے لگے۔ بولی ''ابھی تو مجھ سے بڑی چاروں بہنیں بیٹھی ہیں ان کی شادی نہیں ہو رہی، میری باری تو بہت دور ہے۔ شاید تب تک میں بوڑھی ہو جاؤں!'' پتہ نہیں یہ صدیوں پرانے رسم ورواج کب ختم ہوں گے؟ یہ ظلم کب بند ہوں گے؟

آج بھوک ہڑتال کی تیسری رات ہے صرف چائے پر گذارہ ہے۔ نسیم کچھ کمزور ہوگئی ہے۔ باہر کی کوئی خبر نہیں، اخبار بھی نہیں ملتا۔ کوئی کتاب بھی نہیں ہے۔ سارا دن یونہی بیکار گزر جاتا ہے۔ اس وقت کتاب کی کتنی ضرورت ہے! کبھی کبھار طلباء کے نعروں کی آوازیں سننے میں آتی ہیں۔ تب شیخ ایاز کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ابھی جنگل سے چیخ کی صدا آتی ہے،
یہ مت سمجھنا کہ سارے مور مرگئے ہیں۔

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۲۷-۷-۷۰

رات نو بجے

میں آہنی دروازے کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھی ہوں۔ میرے پاس ہی نسیم بیٹھی ہے اور اپنی ہم زبان بوڑھی میٹرن کے ساتھ سرائیکی میں باتیں کر رہی ہے۔ میں کبھی نسیم کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتی ہوں اور کبھی میٹرن کو۔ نسیم کتنی خوش ہے کہ اسے اپنی ہم زبان سے اپنی زبان میں باتیں کرنے کا موقعہ ملا ہے! ہر ایک کو اپنی زبان کتنی میٹھی لگتی ہے۔ ضعیف اماں نے ناک میں نسوار کی چٹکی دی، وہ بغیر سپاری کے پان چباتے نسیم سے حال احوال کر رہی ہیں۔ آپا فاروق کوٹھڑی میں چائے بنا رہی ہیں۔ آگ جل ہی نہیں رہی۔ ساری کوٹھڑی دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ وہ بار بار پھونکیں مار رہی ہیں۔ بی بی اور زینب پتھروں پر لاکھ کا ورد کر رہی ہیں تاکہ جلدی رہائی نصیب ہو۔ بکھو، شیر خوار احمد شیر کو پنجابی میں لوری دے رہی ہے اور چھلڑو ماں کے پیروں پر چڑھ کر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ ماں اسے میرے سکھائے ہوئے لوری کے بول ''لیلی لاواں، کھیر بھت کھاواں'' گا رہی ہے۔ سکھ عورت اسی جھولے نما کھاٹ پر پڑی ہے۔ رشیدہ ہمیشہ کی طرح سیدھی لیٹی ہوئی ہے اور اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ بیچاری جوان لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اور اس کی ماں قرآن مجید جلانے کے جرم میں آئی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد ہی سو جاؤں کیونکہ ایک تو گرمی ہے اور دوسرے ہم دونوں ایک ہی چارپائی پر سوتی ہیں اس لئے نیند آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کہیں جا کر بارہ بجے کے بعد رات ٹھنڈی ہوئی ہے۔ نیند کا جھونکا آتے ہی کوئی بچا روتا ہوا اٹھ بیٹھا ہے۔ رشیدہ اٹھ کر چیخنے چلانے لگی ہے۔ پھر دوبارہ نیند کا جھونکا آتا ہے تو صبح چار بجے زینب اور بی بی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور زور زور سے نعرے مارنے لگتی ہیں ''اللہ صمد، دم صابر علی، پیراں موج دا دریا کھول رحم دی گلی'' اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہوں! نسیم تو گہری نیند سوتی ہے خواہ بچے روتے رہیں، مجال ہے جو ٹس سے مس ہو۔ آج گھر سے خیر خبر آئی اور باہر کے حالات اور تحریک

کے متعلق کچھ پتہ چلا ہے، بھائی نے لکھا ہے:

زینا!

صبح سویرے فوجی عدالت میں اس کیس کی سماعت میں گیا تھا جس میں مائی سیجاں کا بیٹا اور عزیز پولیس پر حملہ کرنے کے الزام میں ملوث ہیں۔ (تمہیں مائی سیجاں یاد ہے نا؟ جس کی پولیس نے ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ تمہاری ماں کے ساتھ ہسپتال میں داخل تھی) کورٹ میں ۳ بجے تک جھک ماری۔۔۔ گھنٹہ ڈیڑھ آرام کرنے کے بعد دفتر گیا اور ابھی رات گیارہ بجے لوٹا ہوں۔۔۔ ہم جیسے لوگوں کی زندگی ہی خدا نے ایسی بنادی ہے کہ نہ خود پر ترس آتا ہے اور نہ ہی کسی عزیز رشتہ دار پر۔ رحمدلی کا مظاہرہ کریں تو اپنی قوم اور انسانیت پر ہونے والے مظالم کا بدلہ کیسے لیں گے؟ عزیز و اقارب کا خیال کریں تو قوم کو اس کا حق کیسے ملے گا؟ اپنے آپ اور اپنے پیاروں سے بے نیاز ہو کر اور دل کو سخت بنا کر ہی مظلوم عوام اور دکھی انسانیت کے دکھوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ صدیوں سے ہمارا ظالم طبقے سے سامنا نہیں ہوا ہے۔ اب یہ تاریخی قرض ادا کرنا ہے۔ یہ قرض اپنا پسینہ اور آنسو بہا کر، دکھ اٹھا کر اور خون بلکہ جان دے کر ادا ہوگا۔ یہ تمہارے اور میرے جیسے چھوٹے بڑے لوگوں کے پسینے، آنسوؤں، آہوں اور جانوں کی قربانی سے ہی ادا ہوگا۔

مجھے ہمیشہ خود اس بات کے لئے تیار رکھنا پڑتا ہے کہ نہ جانے کب اچانک جان کی قربانی دینی پڑ جائے۔ اس لئے اگر میں اپنے آپ کو تمہاری موت کی دلدوز اور روح فرسا خبر سننے کیلئے تیار پاؤں تو تمہیں کوئی حیرت نہ ہونی چاہئے۔

اچھا ہمیشہ ساتھ

"ر"

ا بجے رات

سینٹرل جیل

۲۸-۷-۷۰

رات دس بجے

آج ہمارا بھوک ہڑتال کا پانچواں روز ہے۔صبح سے ہی کمزوری محسوس ہورہی ہے۔آج ڈاکٹر آیا،جیسے اتنے دنوں سے اسے ہماری بھوک ہڑتال کی خبر ہی نہ ہو۔جب کہ تمام میٹرنس بھی دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے اس کی رپورٹ بھی کی تھی۔ڈاکٹر ہم سے کہنے لگا کہ یہ غیر قانونی بھوک ہڑتال ہے۔ہم نے جواب دیا''اول تو ہم آپ سے زیادہ قاعدے قانون جانتی ہیں۔دوسری بات کہ ہم آپ کے کسی قاعدے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔اس لئے قانونی یا غیر قانونی،ہم بھوک ہڑتال پر ہیں۔''

ہم اپنی بات پر قائم ہیں۔آج گھر سے خط آیا ہے۔ماں نے لکھا ہے۔

''پیاری بیٹی زینا اور نسیم!

جئے سندھ

اس وقت شام کے سات بجے ہیں۔ایاز نے دال نکالی ہے اور اس کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے۔پھر کھانا بیچ میں ہی چھوڑ کر اور ازار بند لے کر دوسرے کمرے میں بلی کا بچہ باندھنے گیا ہے۔میرے منہ میں چھالیہ ہے۔ایاز ابھی ابھی بھاگ کر باہر نکلا ہے کیونکہ بلی نے اسے غصے میں دانت دکھائے ہیں جبھی تو ڈر کر باہر کو بھاگا ہے۔ہوا کافی تیز چل رہی ہے مگر مجھے محسوس نہیں ہورہی۔۔۔۔کل رات آپا زرینہ اور شیلو آئی تھیں۔رات ۱۰ بجے تک یہیں بیٹھی رہیں۔آج صبح میں اور نسیم کی ماں جیل ملاقات کے لئے اکٹھی آئی تھیں۔ایک بجے تک انتظار کیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔پتہ چلا آج ملاقات بند ہے۔کل میں پشنی کا خط پڑھ کر رو پڑی تھی۔میری آنکھوں سے بس دو ہی آنسو نکلے۔تمہیں تو پتہ ہے میں زیادہ نہیں روتی،بس ایسے ہی کبھی کبھی رونے کی مشق کرتی ہوں۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۲۹-۷-۷۰

تقریباً رات ۱۰ بجے

آج خیر سے چھٹا دن ہے۔ اب تو ویسے ہی سر چکرا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو اتنی سخت بھوک لگتی ہے کہ بس۔ اس وقت ہری مرچیں اور زیارت کے نان یاد آتے ہیں۔ ہم چائے پیتی ہیں تو بھوک مر جاتی ہے۔ آج بھی صبح سے ہی چارپائی پر تھیں۔ منہ ہاتھ دھونے کی طاقت بھی نہ تھی۔ عورتیں ہیں کہ سارا دن چڑیوں کی طرح چوں چوں کرتی رہتی ہیں۔ بیچاری کتنے عرصے سے بند ہیں۔ سارا دن درود وصلواۃ پڑھتی ہیں۔ کوئی کوا جب کبھی دیوار پر یا درخت پر بیٹھتا ہے تو کہتی ہیں ''اڈوے کارا کانگا، اساں کدے چھٹدیاں، اڈوے کالیا کانگا میری منظوری دی چٹھی لے آ'' کوؤں کو پیغام دیتے دیتے یہ وقت آن پہنچا ہے۔ کوے یا تو گونگے ہیں یا پھر سمجھتے ہی نہیں جو ابھی تک رہائی نصیب نہیں ہو رہی اور نہ ہی کوئی خط آیا ہے۔

آج اماں ملاقات کرنے آئی۔ ہم بہت خوش ہوئیں۔ ''شاہ کا رسالہ'' لائی ہیں۔ کتنی مدت کے بعد کوئی کتاب ملی ہے۔ وہ بھی لعل لطیف کا رسالہ! سو ہم نے بھی سارا دن املی کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر سرکھا ہوڑی، سرسوہنی، سرسارنگ اور سرسامونڈی پڑھے اور اردو میں ترجمہ کر کے دوسری عورتوں کو بھی سنائے۔ مدت کے بعد شاہ صاحب کی شاعری نے مزا دیا ہے۔ ہر اک بیت میں انقلابی تعلیم دی گئی ہے۔

آج بھائی کا خط ملا، لکھتے ہیں:

ساون میں تو ہر ایک پانی میں جاتا ہے
لیکن وہ (سوہنی) تو موسلا دھار بارش میں، پانی میں اتر گئی
آؤ تو، سوہنی سے پوچھیں، اس نے پیار کیسے پایا
میہار (مہینوال) نے مر کر منزل پائی

☆☆☆

خواہ میرے پیروں میں لاکھوں کانٹے چبھیں
خواہ میرے پاؤں کچلے گئے پھر بھی میرے انگوٹھے میں موچ نہیں آئی
پیارے کی طرف جاتے ہوئے، کسی ذات برادری کا سوال نہیں

☆☆☆

زینا!

بٹھورے کی طرف کا تکلیف دہ سفر کر کے کل ہی واپس آیا ہوں۔ جنگل تھا، ہرے بھرے کھیت تھے، ٹھنڈی ہوائیں تھیں۔ نہریں پانی سے بھری تھیں۔ تالابوں

میں سفید سفید دودھیا کنول کے پھول تھے، ڈھور ڈنگر (مال مویچھی) اور معصوم معصوم چرواہے تھے، کہیں روشن خیال اور محبِ وطن انسان تھے۔ ایک نرالی دنیا تھی۔ اکیلا آدمی نہ روتے اچھا لگتا ہے اونہ ہنستے۔ آدمی کے ساتھ اگر بور قسم کے دوست ہوں تو مت پوچھو۔۔۔ میرے ساتھ اچھے اور زندہ دل دوست تھے۔ سوایک دن کیلئے ساری بوریت اندیشے اور وسوسے دور ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ سندھ میں اتنے لوگ پڑے ہیں، انہیں کون ختم کر سکے گا؟ بس تھکن بہت تھی بلکہ واپسی پر تو میں بیمار پڑ گیا۔۔۔

زندگی میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جب انسان کو اپنی حیثیت بھلا کر نامعلوم اور بے نشان ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب قومی، طبقاتی اور تاریخی مقاصد کے تقاضوں کا سامنا ہوتا ہے تو انسان خود سے کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی بڑا جتنا حالات تقاضہ کریں، نہ صرف اپنے آپ سے بڑا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ دلیر، بہادر، جفاکش، صابر، شاکر اور شاندار۔ موجودہ دور ایسا ہی ہے۔

صرف تمہارے لئے

"ر"

سینٹرل جیل

۳۰-۷-۷۰

رات ساڑھے نو بجے

باہر سے کچھ آوازیں آ رہی ہیں۔ میں سب کو خاموش کراتے ہوئے انہیں سننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے جیل میں طلباء نے ''جیئے سندھ'' کے نعرے بلند کئے تھے۔ شاید انہیں باہر بھیجا جا رہا تھا۔ آج سارا دن طبیعت بہت خراب رہی۔ خیر سے بھوک ہڑتال کا ساتواں دن گزرا ہے اور ساتویں رات شروع ہوگئی ہے۔ آج صبح اٹھتے ہی سر چکرا رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ہم دونوں چارپائی پر ہی دم سادھے پڑی رہیں۔ اب تو چائے بھی نہیں بھاتی۔ نسیم بہت کمزور ہوگئی ہے۔ بھائی آج وکیل کی حیثیت سے ملنے آئے تھے۔ پانچ منٹ مشکل سے بیٹھے۔ کہنے لگے باہر حالات خراب ہیں شاید (حفیظ) قریشی صاحب کو گرفتار کرلیا گیا ہے، اور ہوسکتا ہے میں بھی جلد ہی سرکاری مہمان بن جاؤں ہنستے ہنستے محسوس ہو رہا تھا دل ڈوب رہا ہے۔

پچھلے وارڈ کا سیل کھلنے اور بند ہونے کی آواز آ رہی ہے۔ کوئی شخص اونچا بول رہا تھا۔ آواز سے تو شناسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ یاد آیا بھائی نے بتایا تھا کہ قریشی صاحب کو گرفتار کیا گیا ہے شاید وہی ہوں۔ بی بی اور زینب نے رشیدہ کو ستانا شروع کر دیا ہے بیچاری پاگل عورت ان کے لئے بس کھلونا ہی ہے۔ ان بیچاریوں کو بھی تو کہیں نہ کہیں دل بہلانا ہے۔ زینب، رشیدہ کو کہہ رہی تھی ''تم نے میرے سگریٹ چرائے ہیں اس لئے میں تمہاری تلاشی لوں گی''۔ رشیدہ کی ماں خاموش بیٹھی تماشہ

دیکھ رہی ہے۔ رشیدہ چلا رہی ہے۔ اس نے ابھی صرف ہاتھ دھو کر فرش پر نماز پڑھنی شروع کی ہے۔ لیکن کیسی نماز؟ ہاتھ باندھ کر زور سے کہتی ہے ''ہز ہائی نس میر کو رشیدہ بی بی بلا رہی ہے''۔ ''ہز ہائی نس میر کو فوراً رشیدہ بی بی کے پاس پہنچنا چاہئے!''۔ ''ہز ہائی نس میر!'' کیا کہہ رہی ہے؟ یہ کون ہوسکتا ہے؟ ممکن ہے ان کی کسی کے ساتھ جان پہچان ہو کیوں کہ یہ بہت امیر لوگ تھے۔ رشیدہ کا باپ انجنیئر تھا۔ اب بھی رشیدہ کی ماں اپنی خاندانی امارت کے قصے سناتی ہے کہ ہمیں انگریزوں نے زمینیں اور باغات بخشش میں دئے تھے، ہم ایران گئی تھیں، بغداد گئی تھیں۔ ایسے ایسے لذیذ کھانوں کا ذکر کرتی ہے جن کے بارے میں ہم نے کبھی سنا بھی نہیں۔ اب بھی انہیں جیل کا کھانا نہیں لگتا، لباس شدید میلا ہونے کے باوجود وہ غصے کی وجہ سے نہیں دھوتیں۔ سر میں جیل سے ملنے والا تیل بھی نہیں ڈالتیں۔ کپڑے دھونے والے صابن سے منہ نہیں دھوتیں۔ ہم کہتی ہیں ''یہ جیل ہے یہاں گذارا کرنا پڑے گا'' جواب میں نہ جانے کون کون سے انگریزی صابنوں کے نام لیتی ہیں اور کہتی ہیں ''ہم ان کے علاوہ دوسرے کسی صابن سے منہ نہیں دھوئیں گی، خراب ہوجائے گا۔'' یہی طبقہ ہم سندھیوں کا دشمن ہے۔ انگریز سرکار کی غلامی کے بدلے انہیں سندھ کے معصوم باسیوں کی زمینیں اور باغات عیش وعشرت کے لئے بخشش کے طور پر ملے، یہ ولایت گھومیں، بنگلوں میں رہیں، طرح طرح کے کھانے کھائیں۔ ریشم اور کمخواب پہنیں اور ان زمینوں، جائیدادوں، علاقوں اور مواقع کے اصل وارثوں کیلئے پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی بھی نہیں ہے۔ تن ڈھانپنے کیلئے کپڑا بھی نہیں۔ دوسری آسائشیں تو

دور کی بات ہے۔ خیر ان مظلوموں کا دور بھی آنے والا ہے اور جن ظالموں نے صدیوں تک ان غریب باسیوں کا خون چوسا ہے ان سے اب اچھی طرح حساب کتاب لیا جائے گا۔ رشیدہ جیل میں آنے کے بعد صدمے سے پاگل ہوگئی ہے بھلا کہاں آرام دہ پلنگ، بنگلے اور طرح طرح کے کھانے اور کہاں جیل، ٹوٹی چارپائی اور پانی جیسی دال!

بڑی مشکل سے سکون ہوا ہے۔ آپا فاروق کچھ لکھ رہی ہیں۔ نسیم سوئی ہوئی ہے، مجھے نیند آرہی ہے۔ کل نہ جانے کیا ہو؟ یہاں تو اخباروں کے لئے بھی ترس گئے ہیں!

ہاں! کل سے ایک قیدی عورت نے بھوک ہڑتال کی ہے کہ اس کی اس کے شوہر سے ملاقات کروائی جائے۔ آج اس کا مطالبہ مان لیا گیا۔

سینٹرل جیل

۳۱-۷-۷۰

رات سوا دس بجے

ایک گھنٹہ پہلے نسیم کی پسلی میں درد ہوا۔ ڈاکٹر آئے انہوں نے اسے بسکو پین کے انجکشن لگائے۔ اب کچھ آرام ہے۔

ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے تک لیکچر دیا کہ بھوک ہڑتال ختم کردیں۔ کہہ رہا تھا کہ جیل میں بھوک ہڑتال کرنا سنگین جرم ہے۔ سزا ملے گی۔ ہم ہسٹری شیٹر ہو جائیں گی اور پتہ نہیں کیا کیا ہوگا۔ ہم نے اس کی تقریر سن کی آخر میں صرف ایک جملہ کہا کہ ''ہم بھوک ہڑتال ختم نہیں کریں گی۔''

سارا دن چپ چاپ چارپائی پر گذار دیا۔ گھر سے خیر خبر آئی تو خوشی ہوئی۔ آج بھی ہم نے صرف چائے پی۔ نسیم تو بالکل کمزور ہوگئی ہے۔ آج شاہ لطیف کو بہت پڑھا۔ کئی اچھے اچھے بیت نسیم کو پڑھ کر سنائے۔

لڑا لڑ کر کردیا مشکل کام آسان
بھوکا پیٹ رکھا، نہ پالا کوئی ارمان
ایسے ہی انسان، منزل کو پہنچے ہوئے

شعر پڑھ کر میں نے دل میں سوچا، ہم موم سے زیادہ نرم ہیں۔ ہم نے کبھی سختیاں دیکھی نہیں ہیں۔ ایسے عظیم لوگ بھی گذرے ہیں جنہوں نے انسانیت کی بھلائی کے لئے خود کو بھلا دیا۔ زندگی کی سب آسائشیں، سب عیش و آرام ترک کر دیئے۔ ایسے لوگ ہی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ویسے بھی جب تک کوئی شخص اپنے نفس اور خواہشات کو نہیں مارتا، حرص، لالچ اور پیٹ پوجا سے اوپر نہیں اٹھتا، وہ اپنے نصب العین میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہم شہری لڑکیوں کا کیا ہے؟ سموسے اور پکوڑے کھانا، فیشن کرنا، فلمیں دیکھنا، ہم بھی لڑکیاں ہیں اور چین، ویتنام اور فلسطین کی بھی لڑکیاں ہیں جو اپنے وطن کی خاطر گولیوں کے سامنے کھڑی ہیں۔ ان کے سامنے ہم کتنے حقیر ہیں! جو حسن، سچائی اور عظمت ان لوگوں میں ہے اس کا رتی برابر بھی ہم میں نہیں۔ ہم میں سے اکثر لڑکیاں انتہائی خوبصورت ہیں لیکن ان کی خوبصورتی اور جوانی کس کام کی؟ ساری عمر فلمیں دیکھ لیں۔ لپ سٹکس تھوپ لی اور اچھے کپڑوں کی خواہش میں جا مریں۔

میں نے اپنا وقت بھی یونہی ضایع کر دیا۔ بھائی پچھلے سال سے پڑھنے کیلئے کہہ رہے تھے مگر میں نے ایک نہ سنی، میں بھی کتنی کاہل ہوں۔

جو کاتنے کے دن تھے، وہ تو بیٹھ کر گنوا دئے
کوئی بھی کام وقت پر پورا نہ کر سکی
اب تو پیاروں کے پاس کیسے جائے گی۔

آج اماں کا خط آیا ہے۔

پیاری بیٹی اختر اور نسیم!

جئے سندھ

امید ہے کہ تم دونوں اپنے قول پر مستحکم ہونگی۔ زندگی نام ہی تکلیفوں کا ہے جن سے گذر کر ہی انسانوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ انہیں کتنے دکھ اور تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں۔ تم نے تو یہ دکھ اور تکلیفیں اپنی قوم، اپنے ملک کے لئے خوشی سے قبول کیے ہیں اس لئے ہنستے ہوئے انہیں گلے سے لگائے رکھو۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل

۱-۸-۷۰

رات ساڑھے آٹھ بجے

آج ہماری بھوک ہڑتال کی نویں رات شروع ہوئی ہے۔ ابھی تک اتنی ہمت ہے کہ ہم چل پھر رہی ہیں۔ آج صبح سے ننھا ایاز بہت یاد آ رہا ہے۔ گھر میں سارا دن تنگ کرتا تھا۔ کتاب لے کر بیٹھتی ہی تھی کہ چلانے لگتا ''زینا! روٹی دو، بلی کے بچے پکڑ کر دو!'' اور کبھی کبھی تو ویتنامی گوریلا بن کے لڑتا اور پوچھنا شروع کر دیتا ''زینا! اچھا پھر بتاؤ جنگ کب ہوگی؟ اپنا گھر بھی تباہ ہو جائے گا تیا (کیا)۔۔۔ میری سائیکل بھی ٹوٹ جائے گی؟ ہیں؟ بتاؤ نہ زینا!۔۔۔ پھر میں اور میرے دوست، دشمنوں پر چھپ چھپ کر بم پھینکیں گے۔۔۔''

تب میں ایاز سے کتنا بیزار ہو جاتی تھی۔ تنگ آ کر ڈانٹتی تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا تھا۔

آج سوچتی ہوں کہ ایاز ہو اور وہ مجھے تنگ کرے! وہاں اتنی کتابیں تھیں تو پڑھی ہی نہیں جاتی تھیں اور اب ضرورت ہے تو وہ ہیں ہی نہیں۔ جیل کی لائبریری سے بھی نہیں ملتیں۔

ہاں سچ! رات طالب علموں کو دوسرے وارڈ میں جانے کیلئے کہا گیا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ تب میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، دو جیلروں اور صوبیدار نے ان پر بے انتہا تشدد کیا۔ بہت دکھ ہوا۔ دکھ تو سپرنٹنڈنٹ پیر صاحب کے رویئے پر ہوا

جنہوں نے اپنی رگوں میں سندھ کے روایتی باغیرت خون ہوتے ہوئے بھی گھٹیا عہدے اور نوکری کی خاطر سندھ کے سپوتوں پر اپنے ہاتھوں سے تشدد کروایا۔ بہر حال ہم نے یہ سب تکلیفیں، مار پیٹ اور بھوک برداشت کرنے کی قسم کھا رکھی ہے لیکن سندھ کے عوام ان غداروں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ (بقول لطیف)

کھپر (زہریلے سانپ) نے جوگیوں سے دشمنی مول لی ہے
سانپ تمہارے پاؤں پر گرنے کے بعد بھی نہیں جائے گا
یہ انہی کا کام ہے جنہوں نے جھونا گڑھ کو آگ لگائی

اس واقعے کے بعد طالب علموں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ آج بھائی کا خط آیا ہے۔ لکھتے ہیں:

زینا!

میں آج پھر جیل آیا تھا۔ قریشی صاحب اور کچھ طالب علموں کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ پتہ چلا ہے کہ کچھ طلباء کو زبردستی نارا جیل بھیج دیا گیا ہے۔ جیل میں بہت ہنگامے ہوئے ہیں۔ طلباء کو تم لوگوں کی بھوک ہڑتال کا پتہ ہی نہیں ہے۔۔۔
بدقسمتی سے مجھے تم لوگوں سے ملنے کا وقت نہیں مل سکا کیونکہ میں انتہائی مصروف ہوں۔

سینٹرل جیل

۲-۸-۷۰

رات بارہ بجے

آج رات تو نیند ہی نہیں آ رہی۔ گرمی بھی بہت ہے۔ بارہا سونے کی کوشش کی ہے لیکن نیند نہیں آ رہی۔ سکھ عورت کو کھانسی کا دورہ پڑا ہے، کافی دیر سے کھانس رہی ہے۔ ایک تو وہ چھوٹے قد کی اور دبلی پتلی سی ہے، دوسرے جھولا نما چارپائی، اس لئے دکھائی ہی نہیں دیتی۔

انسان کے حالات کتنی جلدی بدل جاتے ہیں! یہ ماسی گرو بھی کسی دور میں بڑے عیش و آرام میں تھی۔ مسلمان ہوئی، مسلمان سے شادی کی۔ وہ آدمی اسی سینٹرل جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس کی بیوی ہونے کے ناتے گرو بھی جیسی جیل کی مالک تھی۔ ساری میٹرنس اسکی سلامی بھرتی تھیں۔ زنانہ وارڈ گھومنے کیلئے آتی تو سب قیدی عورتیں احتراماً ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ پھر ہندوستان گئی جہاں دوبارہ سکھ مذہب اختیار کر لیا۔ اب وہ کہتی ہے کہ اس کے شوہر نے ہی اسے قید کروادیا ہے۔ اسے ابھی تک خرچ دیتا ہے۔ اس وقت نیم پاگل لگتی ہے۔ اپنے دور کی ایک کالی میٹرن سے سارا دن شوہر اور بچوں کی باتیں پوچھتی رہتی ہے ''میری بچے بڑے ہو گئے ہوں گے، کیا پڑھتے ہیں؟ کون سنبھالتا ہے؟ کیسے ہیں؟'' میٹرن جب اس کے شوہر اور بچوں کی باتیں بتاتی ہے تو اس وقت اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی اور چمک آ جاتی ہے۔ کہنے لگتی ہے ''میں اپنے ہاتھ سے اپنے میاں کیلئے روٹی پکاتی تھی۔ اب پتہ نہیں نوکر اچھا کھانا پکاتے ہوں گے کہ نہیں؟ پتہ نہیں گھر کا کیا حال ہوگا؟ میں تو روز

دھلاتی تھی!'' میں نے کل ماسی گرو سے کہا ''ماسی! تمہیں گھر اور بچے اتنے یاد آتے ہیں، تو انہیں بلا کر دیکھ کیوں نہیں لیتی؟''۔ کہنے لگی ''آگ لگے! میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے؟ اب میرا مذہب الگ ان کا الگ۔ میں تو ان کے ہاتھوں کا پانی تک نہ پیوں!'' لیکن چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسکے دل میں ان کے لئے بہت پیار ہے۔ جیل میں شیر خوار احمد شیر کو سارا دن کھلاتی رہتی ہے۔ جیل سے ہندو بھتہ لیتی ہے پانی کا مٹکا بھی جدا ہے۔ رسم رواج، مذہب، ذات، خاندان یہ دیواریں کتنی اونچی ہیں جو ماں کو اولاد سے بھی توڑ دیتی ہیں۔''

آج گھر سے اماں کا خط آیا ہے:

پیاری بیٹیو زینا اور نسیم!

جئے سندھ

خط ملا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہماری جدوجہد کامیاب ہوگی۔ جیل حکام نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل بکواس ہے اگر سچ بھی ہے تو بہت کم۔

نسیم کا خیال رکھنا بہت بہادر مجاہد ہے۔ اسے تھوڑا گلوکوز پلانا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر تم لوگ مر بھی گئیں تو کیا ہے؟ امر ہو جاؤ گی ہر روز لاکھوں لوگ یونہی بے مقصد موت مر رہے ہیں۔ کیا تمہیں گھر میں کبھی موت نہ آئے گی؟

تمہاری ماں

سینٹرل جیل حیدرآباد

۳-۸-۷۰

رات گیارہ بجے

کل سے ڈاکٹر نے ہمیں تنگ کرنا شروع کردیا ہے کہ بھوک ہڑتال ختم کردو۔کل کچھ فوجی افسر ڈاکٹر افغان سے ملنے آئے تھے اس لئے اتوار کا دن ہوتے ہوئے بھی جیل میں گہما گہمی تھی۔ہمیں بھی میٹرن نے بہت جلد اٹھادیا اور عورتوں نے صفائی شروع کردی۔دونوں میٹرنس مکمل ڈریس میں خوب بیلٹ وغیرہ باندھ کر کھڑی تھیں۔کہنے لگیں ''ہوسکتا ہے یہاں بھی آئیں۔''

آج ڈاکٹر کہنے لگا ''تم جرم کررہی ہو۔بھوک ہڑتال فوراً ختم کردو ورنہ میں تمہیں زبردستی جیل کی ہسپتال میں لے جاکر الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کردوں گا اور مرد قیدیوں کے ہاتھوں سے زبردستی کھانا کھلا کر بھوک ہڑتال ختم کروادوں گا۔''ہم نے کہا ''ہم ہر تکلیف، ہر بے عزتی، ہر مصیبت برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں۔''

آج کمزوری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔دماغ بے حد گھوم رہا ہے اس لئے زیادہ وقت چارپائی پر لیٹے ہی گذرتا ہے۔سارا دن وارڈ میں شور مچا رہتا ہے۔عورتیں بالکل فارغ ہیں اس لئے دن بھر آپس میں لڑتی جھگڑتی اور پھر صلح کرتی رہتی ہیں۔ایک دوسرے کو طعنے دیتی ہیں اور پھر مل بیٹھ کر گانے گاتی ہیں۔آج بھی زبردست جھگڑا ہوا۔ہوا یوں کہ زینب نے منت مان رکھی تھی۔اس نے پانی کے دو گھڑے بھر کر اور ان پر دم کر کے کھڑکی میں رکھ دئے کہ جس دن اس کی ضمانت ہوگی اس دن وہ ان مٹکوں کا پانی گرا دے گی۔پتہ نہیں بی بی نے بھولے سے یا جان بوجھ کر ان مٹکوں میں سے ایک کا ڈھکن اٹھا کر پانی پی لیا۔بس پھر کیا تھا۔زینب اور نظیراں نے بی بی کو گھیر لیا اور کہا ''تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تم چاہتی ہو کہ ہم رہا نہ ہوں! لیکن خدا نے چاہا تو ہم چھوٹ جائیں گی اور تم یہیں رہوگی۔''اس پر اتنا شور ہوا کہ سپاہی آکر دروازے پر کھڑے ہوگئے۔۔۔

ان عورتوں کو پورا یقین ہے کہ اگر مٹکے کا ڈھکن نہ اترتا تو وہ رہا ہوجاتیں۔مگر اب وہ رہا نہیں ہوں گی۔

سینٹرل جیل حیدرآباد

۴-۸-۷۰

رات کے آٹھ بجے

اب تو بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ دل متلانے لگتا ہے۔ سر چکراتا ہے۔ آج ڈاکٹر آیا تھا اور وزن کرنے کے بعد چلا گیا۔

آج اماں کا یہ خط آیا ہے:

میری پیاری بیٹی

جئے سندھ

جسے لو نے جھلسا دیا، وہ سسئی اب سیج چڑھے گی۔

کل کا سارا دن بڑی کشمکش میں گذرا کہ پتہ نہیں تم لوگ ہسپتال میں ہو۔ کوٹھڑیوں میں بند ہو یا خدا کے پاس پہنچ گئی ہو۔ ہزاروں لاکھوں وسوسے اور خیال آتے رہے، کبھی زیارت والے دن آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور کبھی تمہاری کمر پر لدے سامان والا منظر، کبھی تمہارا قبر والی جگہ پر بیٹھنا اور کبھی دوسری لڑکی کو پانی لانے کے لئے کہنا۔ کبھی تمہارا ناراض ہونا۔ گویا ساری ساری رات زیارت کے منظر ایک فلم کی طرح چلتے ہیں۔ سوچ رہی تھی کہ جا کر کوئی فلم دیکھ آؤں۔ فلم کے پوسٹر بھی دیکھے مگر پھر اچانک خیال آیا کہ ہائے اللہ! زینا تو ہے ہی نہیں پھر کیسے دیکھوں!

سارا دن ریڈیو کھلا رہتا ہے۔ خیالات کو کہاں لے جاؤں؟ ہر گیت میں

تمہاری صورت سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔اس وقت نور بانو گا رہی ہے

جانے کیوں اتنے دن لگ گئے
درد کب مٹیں گے؟

رسول بخش (پلیجو) ملٹری کورٹ گیا ہے۔ تمہیں خط نہ لکھ سکا۔ شاید آج تمہارے پاس آئے۔اب محمد جمن گا رہا ہے۔اب سارے راگ اچھے لگ رہے ہیں،لطف ہی اور ہے۔۔۔

۔۔۔شاید میں خود بھی کل صبح آؤں، ویسے دل نہیں چاہتا کیونکہ جیل حکام کا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔سارا دن بٹھا بٹھا کر پھر جواب دے دیتے ہیں۔۔۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل حیدرآباد

۶-۸-۷۰

رات کے ساڑھے نو بجے

آج صبح ہم دونوں کی مشکل سے آنکھ کھلی۔ سر بہت چکرا رہا تھا اور دل ڈوب رہا تھا۔ چائے بھی نہیں پی جا سکی۔ ایسا لگتا ہے کہ پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اچانک دروازہ کھلا، ہم نے کان کھڑے کر لئے۔ میٹرن نے چیخ کر کہا ''لڑکیو! کورٹ جانے کیلئے تیار ہو جاؤ!'' ہم نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور اجرکیں اوڑھ کر بیٹھ گئیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہمیں لے گئے اور پولیس کی بند گاڑی میں سوار کروادیا۔ ہمارے ساتھ پانچ طالب علم بھائی بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد گاڑی رکی۔ دروازہ کھلا تو دیکھا کہ ہم ایک دفتر کے سامنے کھڑے تھے۔ ہمیں دفتر کے باہر پڑی ایک بینچ پر بٹھایا گیا۔ طلباء کی ہتھکڑیاں اتار کر انہیں تھوڑی دور پڑی ایک اور بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ یہ میجر شیر افضل کی فوجی عدالت تھی۔ وہ خود ابھی تک نہیں آئے تھے۔ تب تک ہم ادھر ادھر کی چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ کچھ سپاہی کسرت کر رہے تھے کچھ پریڈ میں مصروف تھے اور کچھ بالٹیاں اٹھا کر پانی بھر رہے تھے۔ گویا ہر کوئی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میجر آیا۔ ہمیں بلایا گیا اور ہم سب جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ میجر نے ہمیں کیس پڑھ کر سنایا اور کہا ''آپ کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے'' پھر دو سپاہیوں اور انسپیکٹر نے ہمارے خلاف گواہی دی ''انہوں نے بھوک ہڑتال کی ہے''۔ ان میں سے ایک سپاہی جھوٹا تھا کیونکہ ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن انکار تو کرنا ہی نہیں تھا۔ ہم سے میجر نے

پوچھا کہ ''کیا یہ کیس سچا ہے اور گواہ سچ کہہ رہے ہیں؟'' تو ہم سب نے ہاں میں جواب دیا۔ ہمیں ایک فارم دیا گیا جو ہم نے پُر کر دیا کہ ہم نے واقعی بھوک ہڑتال کر رکھی ہے اور ہمارے مطالبات ہیں کہ ''ڈاکٹر افغان پر جھوٹے مقدمات ختم کئے جائیں۔ ان کے علاوہ فاضل راہو، حفیظ قریشی، ڈاکٹر کامل اور دیگر رہنماؤں اور کارکنوں کو آزاد کیا جائے۔ جھوٹے ڈومیسائل دینے بند کئے جائیں'' وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد میجر نے فائل بند کی اور کہا ''ٹھیک ہے آپ لوگوں نے خود اقرار کیا ہے اس لئے سزا تو ضرور ملے گی، لیکن آپ سب پڑھے لکھے ہیں، آپ کو علم ہے کہ اسلام میں بھوک ہڑتال کرنا گناہ ہے۔ بھوک ہڑتال تو گاندھی کا رواج ہے آپ نے یہ برا کام کیوں کیا؟''۔ میں نے جواب دیا ''آپ طاقتور ہیں، آپ کے پاس فوجیں، ہتھیار، جیل، پولیس یعنی ہمیں دبانے کیلئے ہر ہتھیار موجود ہے۔ لیکن ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم آپ سے کس طرح اپنا حق مانگیں۔ آپ جو ہم پر ظلم ڈھاتے ہیں اس کے خلاف ہم کیسے آواز اٹھائیں؟ پھر چاہے یہ رواج کسی نے بھی ڈالا ہو لیکن ہمارے ہتھیار تو یہی بھوک ہڑتالیں، مظاہرے، جلسے اور جلوس ہیں۔'' نسیم کو دیکھ کر کہنے لگا ''یہ تو بہت کم عمر لڑکی ہے اسے شاید زبردستی بھوک ہڑتال پر بٹھایا گیا ہے!''۔ نسیم نے کہا ''میں اتنی بھی کمسن نہیں ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مجھے پتہ نہ چلے۔ میں نے اپنی رضامندی سے بھوک ہڑتال کی ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ''اگر تمہیں بچوں کی تعلیم کے لئے رکھا جائے تو تم انہیں کیا درس دو گی؟''۔ میں نے کہا ''سب سے پہلے میں انہیں ظلم کے خلاف نفرت اور مظلوموں سے پیار کرنا سکھاؤں گی''۔

کہنے لگا ''پھر تو ہمارے بچوں کا خانہ خراب ہو جائے گا''۔ میں نے جواب دیا ''آپ کے بچوں کا یقیناً خانہ خراب ہوگا۔ ہمارے بچوں کا نہیں''۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ''تم پاکستان کی دشمن لگتی ہو؟'' اس کے علاوہ بھی ہم سے اور کئی سوالات کئے گئے۔ اس نے کہا ''آپ سب لوگ باہر بیٹھیں، آپ کو بعد میں سزا سنائی جائے گی'' ہم باہر جا کر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد طالب علم روشن پنہور کو لے جایا گیا۔ اس کا کیس چلا اور پھر ہمیں سزا سنائی گئی۔ ہم سب کو ایک ایک سال قید اور جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ مجھ پر اور نسیم پر پانچ پانچ ہزار جرمانہ کیا گیا۔ ہم پھر آ کر صحن میں بیٹھیں کہ پولیس کی گاڑی آئے تو ہم جائیں۔ وہاں ایک پنجابی فوجی سپاہی کھڑا تھا اس نے ہمیں دیکھ کر کہا ''آپ سمجھ رہی ہوں گی کہ انہوں نے آپ کو سزا دی ہے مگر قانون ہی ایسا ہے۔ اس لئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟''۔ میں نے کہا ''یہ قانون کوئی آسمانوں سے تو نہیں اترا۔ یہ بھی تمہارا ہی بنایا ہوا ہے۔ بنانے والے بھی تم ہو اور توڑنے والے بھی تم۔''

خیر گاڑی آئی اور ہم جیل پہنچ گئے۔ شام کو ہمیں پتہ چلا کہ مارشل لا اختیارات کے فیصلے کے مطابق ڈاکٹر افغان کا کیس اب فوجی عدالت کی بجائے عام عدالت میں چلے گا۔ اس لئے ہم نے سندھی عوامی تحریک اور دوسرے قومی کارکنوں کی اپیل پر بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

سینٹرل جیل حیدرآباد

۷-۸-۷۰

رات نو بجے

جیل میں آج ہماری سولہویں رات ہے۔ شام کو میں نسیم اور آپا فاروق کے ساتھ مل کر کھیلتی رہی۔ آج زینب ضمانت پر رہا ہوگئی۔ اس کی بھابھی کی ایک کیس میں ضمانت ہوگئی۔ مگر اس کے علاوہ بھی دو کیس ہیں اس لئے چھلڑو پھوپھی کے جانے کے بعد اداس ہوگیا۔ دودھ بھی نہیں پیتا۔ نسیم تھک کر سوگئی ہے اور آپا فاروق گھر خط لکھ رہی ہے۔ میں اپنی روزمرہ والی جگہ زمین پر دروازے کو ٹیک لگائے بیٹھی ہوں۔

کل فجر کے وقت دو آدمیوں کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا کسی لڑکی کے ساتھ عشق تھا اس لئے اس نے خون کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد پھانسی گھاٹ سے ''علی حیدر!' کے نعرے بلند ہوئے۔ پھانسی گھاٹ ہمارے وارڈ کے قریب ہی ہے اس لئے آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کو پھانسی کی کوٹھڑی میں تیسرا سال ہو چلا ہے۔ اپیل اور رحم کی درخواست منسوخ ہوگئی ہے۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ گذشتہ سال رات کو ہمیشہ پھانسی گھاٹ سے گانے کی آواز آتی تھی جس میں سے صرف ایک جملہ ''مجھ پر رحم نہیں کیا گیا۔'' صاف سنائی دیتا تھا اور اس وقت بھی یہی جملہ سننے میں آ رہا ہے۔ میٹرن نے بتایا کہ آج اسی لڑکے کے عزیز و اقارب ملاقات کے لئے آئے تھے ان کے ساتھ اس کی منگیتر بھی تھی مگر لڑکے نے اپنی منگیتر کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ کہتا تھا کہ جو چیز میری نہیں اسے میں

نہیں دیکھوں گا۔ اس لڑکے نے اب پھر گانا شروع کر دیا ہے۔ آواز بہت اچھی ہے اور وہ بہت اونچی آواز میں گا رہا ہے۔

''نہ دل دیندی بیدردی نوں
نہ کونج وانگوں کرلاندی

اسے پورا کر کے، وہ ایک اور گانا گا رہا ہے۔

''تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع جلتی رہے پروانہ چلا جائے گا۔

سچ مچ مجھے رونا آ رہا ہے۔ اس بیچارے کی زندگی کی یہ آخری رات ہے۔ اسے نیند نہیں آ رہی ہوگی، جانتا ہے کہ فجر کے وقت وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلا جائے گا، مگر ان کال کوٹھڑیوں سے پھانسی چڑھنا کہیں بہتر ہے۔ جس لڑکی کے لئے مر رہا تھا پتہ نہیں وہ اسے یاد بھی کر رہی ہوگی یا نہیں! ہوسکتا ہے اسے علم ہی نہ ہو کہ اس کے محبوب کی یہ آخری رات ہے۔ کاش، اس لڑکی کو مرنے سے قبل صرف دیکھ سکے۔

بہرحال ان سب دکھوں اور دردوں کا علاج صرف ''انقلاب'' ہے۔ شیخ ایاز نے کہا ہے:

توڑو اس سماج کو
جھٹکو سامراج کو
اب کوئی نیا نظام!
یہ نظام ہے خراب
انقلاب انقلاب، انقلاب۔

بھائی کا یہ کہنا درست ہے کہ ایک انسان کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اس کے پیچھے اپنی ساری طاقت خرچ کرنے کے بجائے ایسا رستہ اختیار کرنا چاہئے جس سے پوری قوم ان تکلیفوں سے آزاد ہو جائے۔

آج اماں کا یہ خط ملا۔

زینا!

جئے سندھ

جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں لیکن لگتا ہے جیسے مہینے گذر گئے! سال گذر گئے۔

وہ کیا دن تھے، کیا راتیں تھیں
اور حسن کسی کا دیکھنے جیسا تھا
افسوس، وہ نہ رہا، نہ رہا،
وہ گذر گیا، گذر بھی گیا۔

بیچارہ انسان تو موم سے بھی نرم ہے۔ جب کسی کے آنے کی کوئی امید ہوتی ہے تو وہ نظریں دروازے پر گاڑے تکتا رہتا ہے۔ ہر دستک پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اگر امید ختم ہو جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا، سب فنا تھا، جھوٹ تھا۔ ایک سایہ تھا جو اتر کر گم ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنے پیارے انسان، کتنے خوبصورت لوگ اس دنیا میں ایک دوسرے کو بیگانہ اور یتیم کر کے چلے گئے؟ آج ان کی یاد بھی زندہ نہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ خالد نامی ایک لڑکا کھیتوں پر گیا لیکن کبھی واپس نہ آ سکا۔ ماں دروازے پر آنکھیں اٹکائے بیٹھی رہی کہ ابھی آیا۔ مگر وہ کیا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ اس سے بھی اپنا بیٹا بھول چکا ہو گا آج وہ اپنی ہمجولیوں میں ہنستی ہو گی، بولتی ہو گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ''کہ میرا تو اس کے سوا گزارہ نہیں'' یہ سب جھوٹ ہے، گذارہ ہو جاتا ہے۔

پشنی نے آج بھی پرندے لئے۔ ایک اڑ گیا ہے۔ باقی ایک بیٹھا ہے۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، سکھر

سینٹرل جیل، سکھر

۸-۸-۷۰

رات کے آٹھ بجے۔

گھڑی نے رات کے آٹھ بجائے ہیں۔ میں لیڈی جیلر کے دفتر میں بیٹھی ہوں اور بہت بے چین سی ہوں، نسیم کا حال بھی میرے جیسا ہے۔ وہ ابھی جا کر باہر لیٹ گئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بیٹھ کر رونا شروع کردوں، مگر رو نہیں سکتی۔ کل اس وقت ہم حیدرآباد جیل میں تھیں۔ ہمیں علم نہ تھا کہ دوسرے روز کہاں ہوں گی۔ کل رات ڈائری لکھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ تقریباً ساڑھے دس بجے دروازہ کھلا اور سپاہی نے اندر آ کر کہا ''تیار ہو جاؤ۔ میں سمجھ گئی۔ ہم تیار ہو کر نکلے۔ باہر میٹرن بھی کھڑی تھی۔ ہمیں گاڑی میں سوار کرایا گیا۔ کل چھ مسلح سپاہی اور ایک انسپیکٹر تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ گاڑی کی جالیوں میں سے کوٹری کا پل دیکھ کر بھانپ گئی کہ کوٹری ریلوے اسٹیشن لے جایا جا رہا ہے۔ گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی سو ہمیں ویٹنگ روم میں بٹھایا گیا۔ میں نے میٹرن سے پوچھا ''ہمیں حیدرآباد سے ہی کیوں نہیں چڑھایا گیا، کوٹری کیوں لایا گیا ہے۔'' کہنے لگی ''اس لئے کہ کہیں ہنگامہ نہ ہو جائے''۔ تقریباً بارہ بجے گاڑی آئی۔ ہمیں تھرڈ کلاس کے مردانہ ڈبے میں چڑھایا گیا۔ گاڑی میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہ تھی مگر پولیس نے زبردستی لوگوں سے جگہ خالی کروا کر ہمیں

بٹھایا۔ کھڑکی کے قریب میں خود بیٹھی اور ساتھ ہی نسیم اور میڑن بیٹھی۔ جن افراد سے سیٹیں خالی کروائی گئیں وہ ایئر فورس کے طلباء تھے اور سب پنجابی تھے۔ دوسرے طلباء بھی آ گئے اور انہوں نے انسپیکٹر کے ساتھ تلخ کلامی کی کہ انہیں وہاں سے کیوں اٹھایا گیا؟ جھگڑا شروع ہوگیا۔ طلبہ نے انسپیکٹر کو انگریزی میں ڈانٹا۔ بیچارہ سندھی انسپیکٹر سندھی لہجے میں اردو بول بول کر تھک گیا۔ ہم تو گردن جھکائے چپ سادھے بیٹھی تھیں۔ آخر جیسے تیسے جھگڑا ختم ہوا۔ اسٹیشن پر لوگوں نے دو لڑکیاں پولیس کے ہمراہ دیکھیں تو وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ یا تو گھر سے بھاگی ہوئی ہیں یا پھر اغوا ہوئی ہیں۔ وہ ہمارے ڈبے کے باہر آ کر اکٹھے ہوگئے۔ نسیم کہنے لگی ''اختر مجھے بہت شرم آ رہی ہے، اگر ہمیں زنانہ ڈبے میں بٹھائیں تو اچھا ہوتا!'' میں نے نسیم سے کہا: ''ہم یہ سب کچھ سندھی قوم کی خاطر برداشت کر رہی ہیں، جس نے صدیوں تک ہم سے کہیں زیادہ برداشت کیا ہے'' ہماری سامنے والی سیٹ پر دو پنجابی نوجوان بیٹھے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ ہم طالبات ہیں تو وہ ہمیں دیکھ کر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ نسیم سے میں نے کہا ''نسیم! ہم سندھی اجرکیں اوڑھے ہوئی ہیں، ان اجرکوں کی لاج رکھنی ہے، انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سندھی طالبات ایسی ویسی ہیں۔ خیال سے بیٹھنا ہے''۔ جب گاڑی چلی تو میں کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھی رہی، لیکن نسیم کیا کرے؟ وہ یوں سر جھکا کر بیٹھی کہ دوبارہ اوپر نہ کیا۔ میری گردن میں بھی ایک طرف مڑے رہنے کی وجہ سے شدید درد ہوگیا۔ نسیم کو میں نے چادر اوڑھا کر اور اپنے گھٹنوں پر اس کا سر رکھ کر سلا دیا۔ تقریباً صبح پانچ بجے ہم روہڑی پہنچے۔ پولیس وین ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے

ہمیں اسٹیشن سے باہر کرسیاں رکھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ چھ بجے گاڑی آئی اور ہم جیل پہنچے۔ ادھر بھی آدھا گھنٹہ باہر بٹھایا گیا۔ سات بجے جیلر آیا اور ہمیں اندر بلایا گیا۔ میٹرن نے ہماری تلاشی لی۔ ساڑھے سات بجے ہم نے عورتوں کی پکی جیل میں قدم رکھا۔ جاتے ہی جیسے کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کیونکہ ہم کچی جیل کی عادی تھیں جہاں کبھی چار، کبھی آٹھ عورتیں مسافروں کی طرح رہتی تھیں، لیکن یہاں تو مدتوں سے رہ رہی ہیں یا کچھ کو بہت عرصے تک یہاں رہنا ہے۔ ہمیں چاروں طرف سے عورتوں نے گھیر لیا۔ ایک پیلے دوپٹے والی نے ہم سے بیگ لے لیا۔ ہمارے ساتھ جو میٹرن تھی وہ کراچی میں بھی کچھ عرصہ رہ کر آئی تھی اس لئے اسے کئی قیدی عورتوں نے پہچان لیا اور بغلگیر ہو کر رونے لگیں۔ کوئی چھوٹی، کوئی بڑی، سوال پر سوال پوچھنے لگیں، ''کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟'' ہم نے بتایا کہ بھوک ہڑتال کی ہوئی تھی مطالبات بھی بتائے۔ مگر بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سو ہم نے تفصیل سے سمجھایا۔ میں نے پوچھا ''آپ کس جرم میں آئی ہیں؟'' ایک نے کہا ''ہم سب قتل کیس میں اندر آئی ہیں''۔ دوسری نے بتایا ''ہم سب نے اپنے شوہروں کو قتل کیا ہے۔'' یہ سن کر مجھے لگا کہ ان سب کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں اور اب یہ ہمارا بھی خون کر دیں گی۔ تھوڑی دیر کیلئے تو میں اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ سوچنے لگی کہ کاش میرے پر ہوتے اور میں یہاں سے اڑ جاتی۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر میری اجرک کو ہاتھ لگایا تو میں اچانک سہم کر دور ہو کر بیٹھی۔ مجھے لگا کہ اب وہ میرا خون کر دے گی۔ نسیم کو دیکھا تو وہ بھی دہشت زدہ تھی اور عورتوں کے جمگھٹے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر جب میں نے

غور سے ان عورتوں کے چہروں کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سب جھوٹ بول رہی ہیں۔ اتنے معصوم اور دلکش چہرے، خونی کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایک عورت کہنے لگی ''ہم نے پہلے بھی سنا تھا کہ ایک لڑکی جیل گئی ہے۔ پتہ نہیں، وہ کون ہے؟'' میں نے بتایا ''وہ میں ہوں'' تھوڑی دیر کے بعد سب ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ہم بھی حالات کا جائزہ لینے لگیں۔ ابھی اٹھ کر چند قدم ہی چلی تھیں کہ میٹرن نے جھڑک کر کہا ''آرام سے ایک جگہ بیٹھی رہو! ایسے ہی ادھر ادھر مت گھومو!'' ہم نئی تھیں اس لئے یہاں کے قواعد وضوابط کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دوسرے سب ادھر ادھر چل پھر رہے تھے سو ہم نے بھی سوچا کہ گھوم پھر کر دیکھیں۔ اس اثناء میں تیرہ چودہ سال کی ایک لڑکی جو پٹھانی معلوم ہوتی تھی کہنے لگی ''بہن، کہاں سے آئی ہو؟'' اپنی ہم عمر دیکھ کر میں نے کہا ''راستہ بتاؤ تا کہ منہ ہاتھ دھو سکیں''۔ وہ لڑکی ہمیں نل کے قریب چھوڑ کر بولی ''میں جا رہی ہوں۔ مس صاحبہ آنے والی ہیں۔ میں ان کی اردلی ہوں۔'' ہم نے پوچھا ''مس کون ہے؟'' کہنے لگی ''ہماری جیلر ہے' اچانک دل میں ہول سا اٹھا کہ یہ کون سی آفت آن پڑی؟

ہم نے میٹرن کا رویہ نہیں دیکھا تھا۔ سب قیدی عورتیں کام میں لگ گئیں۔ پیلے دوپٹے والی نے مس صاحبہ کے لئے چارپائی نکال کر بچھائی اور وہ خود میٹرن کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ایک ضعیف قیدی کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے زور زور سے دروازہ بجنے لگا۔ میٹرن نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور دوسری کئی عورتیں دوڑ کر آگے بڑھیں۔ سب کہہ رہی تھیں ''مس صاحبہ آ گئی ہیں!'' عورتوں کے ہجوم میں ہمیں مس صاحبہ دکھائی نہ دی۔ دو

خوبصورت گوری گوری لڑکیاں ہمیں نظر آئیں جو بھاگ کر جھولے میں بیٹھ گئیں۔ بمشکل تمام عورتیں سامنے سے ہٹیں۔ ہمیں ایک موٹی سی گوری عورت نظر آئی جس کا پیٹ بہت بڑھا ہوا تھا (بعد میں پتہ چلا کہ حاملہ ہے) پیچھے پیلے دوپٹے والی کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس کے پیچھے پٹھانی لڑکی ٹوکری بغل میں دبائے آ رہی تھی۔ ہم وہیں خاموش کھڑی تھیں، مس تھوڑا دور چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر ہماری طرف مس صاحبہ کی پشت تھی۔ وہ پیلے دوپٹے والی سے کہنے لگی ''لڑکیوں کو بلاؤ!''۔ ہم مس کے سامنے پہنچیں۔ اس نے ہمیں اپنے قریب چارپائی پر بٹھایا۔ ابھی نام ہی پوچھا تھا کہ ایک بہت ضعیف عورت مس کے پیروں میں بیٹھ کر غلط سلط اردو میں مس کی خوشامد کرنے لگی اور کوئی بات کی۔ مس نے ہم سے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بھوک ہڑتال کیوں کرتی ہو؟''۔ مس، واقعی یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، کیونکہ آپ کے حالات ہم سے مختلف ہیں۔ اگر آپ بھی ہماری طرح ظلم و زیادتی کا شکار ہوتیں تو آپ کو پتہ چل جاتا۔'' میرے اتنے کہنے پر ٹوٹے دانتوں والی میٹرن نے مجھے ڈانٹ کر کہا ''تمہیں پتہ ہے مس تمہارے اوپر افسر لگی ہے؟ افسر کے ساتھ یوں بولا جاتا ہے؟'' میں گھبرا گئی۔ دل میں سوچا کہ اس نے مجھ سے سوال پوچھا تھا سو میں نے جواب دے دیا۔ شاید ہمارا بولنے کا حق بھی نہیں۔ میٹرن ابھی خاموش ہی ہوئی تھی کہ ضعیف قیدی عورت نے چیختے ہوئے کہا ''یہ ہمارے مائی باپ ہیں، ان کے ساتھ ایسے مت بولو!''۔ اس کے بعد مس نے اس قیدی عورت کو خاموش کروایا اور ہم سے بولی ''آپ کو بی کلاس دی جائے گی آپ جہاں چاہیں گھومیں پھریں۔ بی اور سی کلاس

دیکھیں۔'' ہم اب تک کھڑی ہی تھیں کہ مس نے ایک چھوٹے قد کی عورت سے جو شکل سے مہاجر لگتی تھی اور لباس سے فیشن ایبل دکھائی دیتی تھی، کہا ''کشور! انہیں لے جاؤ۔'' کشور نے ہمیں ساری جیل گھمائی اور کہنے لگی ''آپ کو علحدہ علحدہ کوٹھڑیاں دی جائیں گی۔' اس وقت کھانا تیار ہو رہا تھا۔ ہمیں یہیں کہیں سے کھانا لا کر کھلایا گیا۔ مس نے ہمیں بلا کر کہا ''میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دوں گی مگر ایک بات یاد رکھیں کہ کسی بھی شخص یا ڈاکٹر سے میری اجازت کے بغیر بات نہ کرنا''۔ ہم نے کہا ''جب آپ ہیں تو ہمیں جو بات کہنی ہوگی آپ سے ہی کہیں گی ہمیں مرد افسروں سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''۔ ہم وہیں ہسپتال میں لیٹ گئیں اور شام کو اٹھ کر غسل کیا۔

سینٹرل جیل، سکھر

۹-۸-۷۰

رات ساڑھے نو بجے۔

نسیم سوئی ہوئی ہے اور میں اسی دفتر میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ نیند آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اندر بیرک سے ایک قیدی عورت کے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے جو اس وقت کانوں کو بہت بھلی لگ رہی ہے۔ آج اتوار کا دن ہے۔ عورتوں کی کام سے چھٹی ہے۔ آج سب نے اپنے اپنے کپڑے دھوئے اور نہائیں۔ مس تھوڑی دیر کے لئے آئی تھی۔ ہم سے کہنے لگی ''آپ لوگوں کو بی کلاس نہیں ملے گی اور دوسروں کی طرح کام بھی کرنا پڑے گا''۔ ہم نے کہا ''ہم کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔'' بولی ''کل پیر کے دن کام بھی مل جائے گا اور قیدی لباس بھی۔ آج بھی ہم بہت افسردہ تھیں۔ مس سے پوسٹ کارڈ لے کر گھر بھیجا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نسیم میرے چہرے کو دیکھتی ہے۔ اور میں اس کے چہرے کو۔ لگتا ہے جیسے یہ سب گھر کے افراد ہوں اور ہم غیر۔ کہاں جائیں؟ کس کے ساتھ بات کریں؟ سب ہمیں عجیب انداز سے دیکھتی ہیں۔ آج صبح اٹھ کر ہم سارا وارڈ گھومتی رہیں۔ وارڈ کے دو حصے ہیں، ایک حصہ سی کلاس کہلاتا ہے اور دوسرا بی کلاس۔ بی کلاس میں عام قیدی عورتیں رہتی ہیں۔ سی کلاس میں دو بڑی بیرکیں اور دو چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں۔ یہ دو کوٹھڑیاں خاص طور پر سزائے موت کی قیدیوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ پھر جب تک اپیل، پٹیل یا رحم کی درخواست کا جواب آئے تب

تک یہیں رکھا جاتا ہے اور میٹرن چوبیس گھنٹے دروازے کے باہر پہرہ دیتی ہے۔ سی کلاس میں لیڈی جیلر کا دفتر ہے۔ اس کے نزدیک شوروم ہے جس میں قیدی عورتوں کا کیا ہوا کام، گلے کی کڑھائی، خوبصورت ڈیزائن دار گلے اور رلی کے نمونے رکھے ہوئے ہیں جنہیں لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ دفتر کی پچھلی طرف دو چھوٹے کمرے ہیں جنہیں گودام کہا جاتا ہے، ایک میں قیدیوں کے گھریلو کپڑے پڑے ہیں دوسرے میں جیل کے کپڑے اور سامان کے ڈبے رکھے ہوئے ہیں۔ بیرک کے آگے صحن اور بہت بڑا میدان ہے جس میں کافی درخت لگے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر آموں کے درخت تو بہت ہی زیادہ ہیں۔ بی کلاس میں ایک طرف بارہ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں اور دوسری طرف بڑی بیرک ہے، جو ہسپتال بھی ہے۔ کھانا وغیرہ بی کلاس میں پکتا ہے، صبح کو باہر تھڑے پر اور دوپہر کو پھر آم کے درخت کے نیچے۔ ہمیں جگہ نہ ہونے کے باعث ہسپتال میں رکھا گیا ہے۔ ہمارے علاوہ چھ عورتیں اور بھی ہیں۔ اب ہماری تعداد آٹھ ہوگئی ہے۔ کشور ہسپتال کی نرس ہے۔ ہم کشور کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یہاں پر دو دو، چار چار قیدی آپس میں اکٹھی رہتی ہیں۔ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کھانا اکٹھے لے کر کھاتی ہیں۔ ویسے سامان ہم سب کا الگ الگ ہے۔ دو ہم، کشور اور اس کی سوتن، خانزادی اور زرینہ ساتھ ہیں۔ سامنے کوٹھڑی میں دو قیدی عورتیں ساتھ رہتی ہیں۔ انہیں ٹی بی کی شکایت ہے اس لئے وہ اکیلی رہتی ہیں۔

گرمی کی شدت زیادہ ہے اس لئے چار ماہ تک یعنی ۱۵ مئی سے ۱۵ ستمبر تک رات کو سی کلاس سے باہر میدان میں چارپائی بچھا کر سونے کی اجازت ہے اور باقی

دو مہینے سورج ڈھل جانے پر وہ بیرکس میں بند ہو جاتی ہیں۔ جیل میں اس وقت اندازاً ۴۵-۵۰ قیدی عورتیں ہیں۔ ان میں اکثریت سندھی عورتوں کی ہے۔ وہ سب قتل کے مقدمات میں بند ہیں۔ چار میٹرنس ہیں۔ ایک ٹھیٹھ سندھی، جبکہ دوسری آدھی پٹھان آدھی مکرانی ہے۔ باقی دو میں ایک پنجابی اور ایک مہاجر ہے۔ چاروں کھا کھا کر پھیل چکی ہیں۔ خیر سے چاروں کے دانت جھڑنے پر ہیں، دو کی دن کی ڈیوٹی ہے، دو کی رات کی۔ چاروں اپنی آنکھوں سے خونخوار لگتی ہیں۔ ہمیں اس طرح دیکھتی ہیں جیسے شکاری شکار جو دیکھے۔ میں ان کی خونخوار آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملا سکتی۔ سوچتی ہوں اگر ذرا سی چوں چاں کی تو وہ مجھے ٹھکانے لگا دیں گی۔ ان میں دو مقدم ہیں، جن کے سفید کپڑوں پر پیلے دوپٹے ہیں۔ آج میں نے قیدی عورتوں کا جائزہ لیا۔ ان کا ایک حصہ غالباً سولہ سے اٹھارہ سال کی خوبصورت لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ بیس سے پچیس سال کی عورتوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ تیسرا حصہ تیس سے ساٹھ سال تک کی عمر کی عورتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں چار پانچ تو خاصی ضعیف ہیں۔ ابھی تک ہمیں ہسپتال میں رہنے والی عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں کا پتہ نہیں ہے۔ ہر ایک مصروف رہتی ہے۔ آٹھ نو عورتیں، جن میں ایک کو چھوڑ کر باقی سب لڑکیاں ہیں، کھانا پکاتی ہیں۔ میری اور نسیم کی چارپائی باہر آم کے درخت کے نیچے بچھی ہوئی ہے۔ گرمی بہت زیادہ ہے۔ مچھر بھی بہت ہیں۔ رات کو بیرکس کے پیچھے یا بی کلاس میں جانا منع ہے۔ مگر میٹرنس دس بجے کے بعد خراٹے لینے لگتی ہیں تب کچھ عورتیں کسی کام کے لئے بی کلاس کا چکر بھی لگا آتی ہیں۔ اس وقت اوپر برجی والے نے آدھی رات کے بارہ گھنٹے بجائے ہیں۔ اب دوسری برجیوں والے بھی گھنٹہ بجا رہے ہیں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۰-۸-۷۰

رات کے دس بجے۔

آج پیر کا دن ہے۔ صبح ابھی اندھیرا نہیں چھٹا تھا کہ بہن زرینہ نے آ کر جگا دیا ''اٹھو چارپائی اٹھانی ہے!'' بہن زرینہ کے ذمے ہسپتال کی صفائی ہے اور ہم جو آپس میں ساتھ کھاتی پیتی ہیں، زرینہ ان کی چارپائیاں بچھاتی اور اٹھاتی ہے۔ ہم نے کہا ''دوسری جانیں اور ان کا کام ہم تو اپنی چارپائیاں خود ہی اٹھائیں گی۔ ہم تم سے زیادہ توانا اور صحت مند ہیں''۔ اس نے بہت اصرار کیا لیکن ہم نے اپنی چارپائیاں خود ہی اٹھائیں۔ دوسروں کی چارپائیاں اس نے خود اٹھائیں۔ ابھی تک اندھیرا ہی ہے اس لئے تب تک ہم نے فجر کی ٹھنڈی ہوا میں چکر لگانے شروع کئے۔ تھوڑی دیر میں ہی سب عورتیں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سی کلاس میں سب نے اپنی اپنی چارپائیاں اندر کیں اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگ گئیں۔ کچھ عورتیں کام نہیں کرتیں اس لئے انہوں نے بننے سنورنے کی تیاری شروع کر دی۔ باورچی خانے والوں نے آگ جلا کر ایک بڑا سا جستی دیگچہ چائے کے لئے رکھ دیا ہے۔ ہم چپ چاپ صحن میں بیٹھ گئیں اور تماشہ دیکھنے لگیں۔ سی کلاس میں کچھ عورتیں لپائی کر رہی ہیں۔ ایک عورت پانی ڈالتی ہے اور دوسری پوچا مار رہی ہے۔ تقریباً آٹھ بجے سب عورتیں چائے وغیرہ پی کر تیار ہو گئیں اور انہوں نے صفائی کا کام مکمل کر لیا۔ میٹرن چیخی ''عورتو، چلو لائن میں''۔ سی کلاس میں بیرکس کے آگے صحن میں عورتیں قطار بنا

کر بیٹھی تھیں۔ کوئی چرخہ کات رہی تھی، کوئی کڑھائی میں مصروف تھی اور کوئی ازار بند بنا رہی تھی۔ ہم بھی آ کر خاموش بیٹھ گئیں۔ مجھے ایک بات بڑی عجیب لگی کہ لائن میں ''سب کیوں نہیں بیٹھیں؟''۔ باورچی خانے میں کام کرنے والیاں، نرس اور ہسپتال کی صفائی کرنے والی بھی فارغ۔ دونوں مقدم عورتوں کو بھی شمار نہ کریں تب بھی کتنی ہی عورتیں بیکار گھوم پھر رہی تھیں۔ مجھے خیال آیا یہ کیسا قانون ہے کہ کچھ تو کام پر ہیں اور باقی بیکار گھوم رہی ہیں۔ ان سب نے سفید قیمتی کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مس آئی۔ اس نے ہم سے پوچھا:

''تمہیں کونسا کام آتا ہے؟''۔ ہم نے جواب دیا ''آپ جو بھی دے دیں''۔ کہنے لگی ''ٹھیک ہے۔ تمہیں کشیدہ کاری کے کام پر لگاتے ہیں۔ عورتوں سے سیکھنا ہے''۔ ہم نے کہا ''ٹھیک ہے۔'' ہمیں کپڑا دیا گیا اور ہم نے قیدی عورتوں سے سیکھنا شروع کر دیا۔ تین چار قیدی عورتیں جو مس کے سامنے بیٹھی تھیں انہوں نے باری باری اس کا جسم دابنا شروع کر دیا۔ قریب دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ میٹرن نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ اس اثنا میں ادھر ادھر گھومتی عورتیں غائب ہو گئیں۔ جب میٹرن نے زور سے کہا ''ڈاکٹر صاحب!'' تو کشور مس کا بچہ پٹھانی کی گود میں چھوڑ کر ہسپتال کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ مس بھی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عورتیں سر پر چادریں درست کرنے لگیں۔ یہ سب کچھ آدھے منٹ میں ہو گیا۔ اس ساری افراتفری، بھاگ دوڑ اور عورتوں کی حواس باختگی کو دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ

''شاید کوئی بڑی آفت آئی ہے''۔ میرے تصور میں ایک تروتازہ موٹا آدمی آیا جو آ کر عورتوں پر تشدد کرے گا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جلدی جلدی ہسپتال کی طرف جیسے بھاگا گیا۔نسیم نے غور سے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف! ڈاکٹر کو جاتا دیکھ کر عورتیں آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔ میرے پاس بیٹھی ایک عورت جو ایک قمیص کے گلے پر کڑھائی کر رہی تھی بولی ''آج ڈاکٹر خوبصورت لگ رہا تھا۔'' پھر دوسری نے کہنا شروع کیا ''بی بی، ڈاکٹر کی پتلون دن بہ دن گھٹنوں سے اوپر ہوتی جا رہی ہے۔'' تیسری نے کہا ''آج کالا چشمہ پہن کر آیا ہے، مس صاحبہ کہتی ہیں کہ اس کی شادی ہونے والی ہے'' ایک اور بولی ''ہمیں یہ کون سے شادی کے چاول کھلائے گا۔'' جب تک ڈاکٹر واپس آیا، اسی طرح کی چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پلٹا تو عورتیں خاموش ہوکر اپنے اپنے کاموں میں مگن ہوگئیں، جیسے کافی دیر سے اسی طرح مصروف ہوں۔ میں نے گردن موڑ کر اپنے پاس بیٹھنے والی عورت کی طرف اس طرح دیکھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ پھر میں نی نظر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ہم نے دوبارہ کان کھڑے کر لئے کہ دیکھیں اب کون آیا ہے تب میٹرن نے پکار کر کہا ''باورچی خانے والیو! راشن!'' اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ کچھ لڑکیاں جو باورچی خانے میں تھیں بھاگ کر باہر آ گئیں۔ کسی نے لکڑیاں اٹھالیں تو کسی نے آٹے کا تھیلا۔ قافلہ چل پڑا۔ پھر پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میٹرن نے پھر زور سے کہا ''ہسپتال والی عورتو! راشن!'' بات میری سمجھ میں نہ آئی تو میں نے پاس

بیٹھی عورت سے پوچھا۔اس نے بتایا کہ جو عورتیں ہسپتال میں زیر علاج ہیں ان کے لئے علیحدہ راشن آیا ہے۔تقریباً ۱۱ بجے بلاوا آیا۔''کھانا لے لو!'' سب عورتیں تھالیاں اور پلیٹیں لے کر کھانا لینے لگیں۔

ہم بھی ہسپتال کی طرف چل دیں اور کھانا کھانے لگیں۔اس کے بعد ہم باہر آ کر لائن میں بیٹھ گئیں۔دوپہر کو عورتیں بیرکس میں اندر جا کر بیٹھتی ہیں۔مس دفتر کے اندر چلی گئی۔ہم تین بجے ہسپتال چلی گئیں۔جن عورتوں کو ہسپتال سے راشن ملتا ہے، وہ اپنا کھانا الگ پکاتی ہیں۔ہم میں سے کشور کی سوتن کو راشن ملتا ہے،اس لئے وہ ترکاری پکا رہی تھی۔ شام کو میں شاہ لطیف کا مطالعہ کر رہی تھی۔اس کے علاوہ اور کوئی بھی دوسری کتاب نہیں ہے۔ہمارے گھر والوں کو سکھر تبدیل ہونے کی اطلاع پہنچ گئی ہوگی۔ پتہ نہیں ملاقات کے لئے آئیں گے یا نہیں۔مچھر بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔سارا چہرہ اور بازو سوج گئے ہیں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۱-۸-۷۰

رات کے دس بجے۔

تھوڑی دیر پہلے عورتوں نے گانے کا پروگرام بنایا مگر مقدم اور میٹرن نے گانے نہیں دیا۔ اس لئے سب اپنے اپنے بستر میں جا کر لیٹ گئیں۔ ہر قیدی عورت کو چار چار کالے کمبل ملتے ہیں۔ آج ہمارا دل کچھ مطمئن ہے کیونکہ ہم نے چند ایک قیدی عورتوں سے شناسائی پیدا کر لی ہے۔ آج نسیم بھی خوش ہے اور اپنے بستر پر نہیں ہے۔ گرمی بہت ہے۔ مس کے دفتر میں حبس ہے اسی لئے اکیلی صحن میں آ کر بیٹھ گئی ہوں۔

صبح کو معمول سے پہلے بہن زرینہ نے مجھے آ کر جگا دیا۔ میں نے کہا ''کیوں بہن زرینہ! ابھی تو رات ہے؟''۔ کہنے لگی ''آج صاحب کی دھڑا دھڑ ہے۔'' ''دھڑا دھڑ'' سن کر میں اٹھ بیٹھی۔ میں نے پوچھا ''آج کیا ہوگا؟'' بولی ''ہر منگل کو صاحب ادھر راؤنڈ پر آتے ہیں۔ آج بھی آئیں گے۔ اس لئے جلدی صفائی کرنی ہے۔ آج سارے وارڈ میں ''دھڑا دھڑ'' ہے!''۔ ہم نے بھی پلک جھپکتے میں چارپائیاں سروں پر اٹھائیں اور ہسپتال کی جانب دوڑ لگا دی۔ سب عورتیں جلدی جلدی تیار ہو کر لائن سے بیٹھ گئیں۔ کشور نے سب کو فوراً ہسپتال سے باہر دھکیلا اور اسے بالکل چمکا دیا۔ سب عورتوں نے سفید کپڑے پہنے ہیں اور بال سنوار کر بیٹھی ہیں۔ آج اماں راستی (مقدم) نے خود کھڑے ہو کر جھاڑو لگائی وہ عورتوں پر برس رہی تھی۔ ہمیں ابھی تک قیدی لباس نہیں ملا ہے اس لئے ہم گھریلو لباس میں ہی لائن میں بیٹھ گئیں۔ آج ٹھیکے میں پھٹے ہوئے کمبل آئے ہیں۔ جنہیں پورا ادھیڑنا ہے۔ اس لئے عورتیں سب کام چھوڑ کر کمبل ادھیڑ رہی ہیں۔ ہم نے بھی دھاگے نکالنے

شروع کر دیئے۔ بہت مشکل سے دھاگے نکل رہے تھے۔ آج مس بھی مقررہ وقت سے پہلے آ گئی ہے۔ اس نے صفائی وغیرہ کی جانچ پڑتال شروع کی۔ میٹرن تھوڑی دیر بعد چیخنے لگتی ہے ''عورتو! صاحب نے آنا ہے۔ صفائی والیو! اٹھ کر جھاڑو لگاؤ!!''۔ جھاڑو والیاں کھجور کے بڑے بڑے پتوں والے جھاڑو اٹھا کر صفائی کرنے میں مصروف ہوگئیں ہیں۔ تقریباً دس بجے سیٹی بجی۔ سیٹی بجتے ہی میٹرنس بلیٹ باندھ کر کھڑی ہوگئیں۔ سب قیدی عورتیں خاموشی سے کام میں مصروف ہوگئیں۔ کوئی بھی عورت بیکار نہیں بیٹھی تھی۔ ایک میٹرن چابی لے کر گیٹ کے تالے کی طرف بھاگی اور دوسری پھانسی گھاٹ کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ تینوں کی نظریں برجی والے سپاہی پر لگی ہوئیں تھیں کیونکہ دور سے صاحب کے آنے پر سپاہی سیلوٹ مارے گا اور میٹرنس ہوشیار ہو جائیں گی۔ اچانک مس نے تالی بجائی! دروازہ کھلا۔ عورتوں کی گردنیں جیسے زمین میں ہی گڑ گئی ہوں۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک موٹا سا آدمی پولیس کی وردی میں سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا ایک ڈنڈا تھا۔ اس کے پیچھے عام کپڑوں میں ایک عمر رسیدہ آدمی چل رہا تھا۔ پیچھے پیچھے پولیس کی وردی میں چار پانچ آدمی چلے آ رہے تھے۔ صحن سے گذرتے ہوئے ایک عورت نے کوئی درخواست کی۔ ان سب نے ہاں ہاں میں ایک بات سنی اور مس سے اس بارے میں پوچھنے لگے۔ مس نے کچھ جواب دیا اور پھر وہ بی کلاس سے جلدی جلدی چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ آگے آگے چلنے والا ڈنڈا بردار صاحب ہوگا مگر پتہ چلا کہ وہ صوبیدار تھا اور ''صاحب'' تو وہ پاگل سا عام کپڑوں والا شخص تھا۔ مجھے اس پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ چلنے میں جو غرور اور دبدبہ صوبیدار کا تھا وہ ''صاحب'' میں قطعاً دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوپہر کو کوئی کام نہ تھا اس لئے باورچی خانے میں جا کر میں نے خود دال پکائی، بہت مزا آیا۔ سب عورتیں حیران ہو رہی تھیں۔ وہ کہنے

لگیں ''تمہیں کیا ضرورت ہے؟ تم کشیدہ کاری میں ہو، جا کر وہ کرو!''۔ میں نے جواب دیا کہ ''مجھے مزا آتا ہے''۔ آج صبح کچھ طلباء کو حیدرآباد سے لایا گیا۔ وہ آتے ہی نعرے لگانے لگے۔ شام کو عورتیں آ کر اکٹھی ہوئیں اور بولیں کہ چونکہ ہم پڑھی لکھی ہیں اس لئے انہیں بھی کچھ سنائیں۔ اس پر میں نے سرماروی پڑھ کر سنایا۔ بیت سن کر، بعض ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں اور بعض اپنی آنکھوں سے پانی صاف کر رہی تھیں، ناک سڑک رہی تھیں۔ جب میں نے یہ بیت پڑھا۔

نہ کوئی آس ہے، نہ کوئی اونٹ گذرا ہے
نہ ہی میرے بھائی کے گھر سے کوئی آیا ہے
پھر مجھے ان کے بارے میں کس طرح معلوم ہو۔

تو اسے سن کر ان میں سے کئی ہچکیاں بھرنے لگیں۔ یہی نہیں انہوں نے مجھے بھی رلا دیا۔ میں مزید نہ پڑھ سکی اور پھر دفتر پہنچ کر کافی دیر تک ان عورتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اتنی لمبی سزائیں ہیں، کیسے پوری کریں گی؟ انہوں نے قتل کیوں کئے؟ ان قتل کی ملزمان یہی ہیں یا کوئی اور؟ یا پھر کوئی اور بات ہے!

سارے جرائم جاگیردارانہ نظام کی گندگی اور ظالمانہ رسم ورواج کا نتیجہ ہیں جنہوں نے جیتے جی انسانوں کو مار ڈالا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۲-۸-۷۰

رات کے پونے دس بجے۔

تھوڑی دیر پہلے کزبانو سے گانا سن کر بیٹھی ہوں۔ گورے رنگ، چوڑے چہرے اور خوبصورت بھرے جسم کی کھوسہ قبیلے کی عورت کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے۔ اس نے اپیل دائر کی مگر ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ گرمیوں کا موسم ہو یا سردیوں کا، وہ چوبیس گھنٹے کوٹھڑی میں بند رہتی ہے۔ سرِشام دوسری عورتیں اس کی کوٹھڑی کے آگے اکٹھی ہوجاتی ہیں، کبھی اس سے کوئی کافی سنتی ہیں اور کبھی خود سناتی ہیں۔ آج شام بھی وہ گا رہی تھی جب تمام عورتیں اکٹھی ہوگئیں۔ ہم بھی جا کر سننے لگیں۔ آواز بہت مدھر ہے! اس نے ہمیں ایک لوک گیت سنایا:

''جوگن مرلی بجا رہی ہے،
میں اپنے بابل کو ڈھونڈ رہی ہوں،
میں اسے گاؤں میں ڈھونڈ رہی ہوں
اور ڈھونڈ رہی ہوں پردیس میں۔''

اس کے بعد اس نے دوسرا گیت سنایا:

''جوگی بابل تو یہاں کہیں بھی نظر نہیں آئے،
نظر نہیں آئے، سارے لوگ پرائے۔''

اتنا خوبصورت گیت میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ یہ گیت ریڈیو کے ان کھوکھلے گیتوں جیسے نہیں ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

کزبانو سے میں نے پوچھا ''تم نے اپنے شوہر کو قتل کیوں کیا؟''۔ ہنے لگی ''مجھے ایک دوسرے مرد سے پیار ہوگیا تھا!''۔ پھر بولی ''ہم دونوں کے ساتھ ساتھ میرے ماموں کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی ہے حالانکہ میرے ماموں بالکل بے گناہ ہیں''۔ کہنے لگی ''اگر اس بار چھوڑ دیں تو زندگی بھر ایسا کام نہیں کروں گی! لیکن اگر نہیں چھوڑتے تو بیس سال کی سزا ہی دے دیں، پھانسی تو نہ دیں۔''

میرے دل نے کہا کہ کاش میرے بس میں ہو تو میں اسے ہمیشہ کے لئے آزاد کردوں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۳-۸-۷۰

رات بارہ بجے

آج بہت گرمی ہے۔ دم گھٹ رہا ہے اوپر سے مچھروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایک پل بھی چین سے بیٹھا نہیں جا رہا۔ بیرک میں ابھی تک اماں مہلاں کا بیٹا علی خان رو رہا ہے۔ کچے قیدیوں کو گرمیوں میں باہر سونے کی اجازت نہیں ہے۔ اماں مہلاں کے کیس کو یہ دوسرا سال ہے۔ مقدمہ ابھی چل رہا ہے، اس کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ شوہر کو قتل کرنے کے الزام میں آئی ہے۔ کہنے لگی ''میں نے نہیں مارا۔ ہم بیل گاڑی پر جا رہے تھے کہ گاڑی الٹ گئی۔ میں بھی زخمی ہوگئی۔ میرا شوہر بہت ضعیف تھا۔ اس لئے گرتے ہی مر گیا۔ میرے دیوروں نے مجھ پر جھوٹا کیس کر دیا ہے۔ پولیس نے راہ چلتے ایک نوجوان لڑکے کو بھی جیل بھیج دیا ہے۔ وہ لڑکا مشکل سے چودہ پندرہ برس کا ہوگا۔ کیس بنایا گیا کہ یہ عورت اس لڑکے کے ساتھ خراب تھی، اسی لئے شوہر کو گاڑی سے گرا کر مار دیا ہے'' اماں مہلاں کی آواز بہت اچھی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اپنے بیٹے کو لوری دیتی ہے تو ساری جیل میں اس کی آواز گونج جاتی ہے۔

نل چلانے کی آواز آ رہی ہے۔ عورتیں ابھی تک نہا رہی ہیں۔ اچھی بات ہے کہ نلکا ہے اور پانی زمین سے آتا ہے اس لئے ٹھنڈا ہے، جیسے کہ برف۔ ادھر رات کو دو تین کے علاوہ کوئی بھی قیدی عورت چولا نہیں پہنتی کیونکہ یہ چولے اتنے موٹے ہیں کہ سردیوں میں بھی نہیں پہنے جا سکتے۔ ایک گرمی، دوسرے کام اور تیسرے موٹے

کپڑے، اس لئے تمام قیدی عورتوں کے نرم و گداز پٹھے دانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب تک رات گذرے تب تک بیٹھی رہتی ہیں۔ ایک نلکا چلائے گی تو دوسری نہائے گی۔ اتنی تکلیفوں کے باوجود نل کے نیچے نہاتے ہوئے ایک دوسری سے اور میٹرنس سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں جیسے اپنے گاؤں کے کسی کنوئیں پر بیٹھی ہوں۔ آج کل چاندنی راتیں ہیں۔ چاندنی میں نل پر بہت میلا لگتا ہے۔ میں اور نسیم صرف تماشہ دیکھتی ہیں۔ نسیم کہتی ہے ''اختر ہم کیا ترکیب کریں کہ یہ سب عورتیں آزاد ہو جائیں؟ اچھا یوں کرتے ہیں کہ یہ لوگ مجھے سزا دے دیں اور میری جگہ کسی ایک کو آزاد کر دیں''۔ نسیم جیسی معصوم بچی، جس کے دل میں کسی کے لئے بھی کوئی حسد نہیں، کوئی دغا نہیں، کوئی دشمنی نہیں، جب ایسے بچوں جیسے سوال کرتی ہے تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔

گھر سے خط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟ ورنہ ضرور خط لکھتے۔ خدا جانے اماں بیمار ہے یا بھائی ٹھیک نہیں ہے۔ پتہ نہیں بھائی کیسے ہیں؟ ہمیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ منی آرڈر بھی نہیں آیا۔ دوصابن تاج سے ادھار لئے ہیں۔ قیدی لباس ابھی تک نہیں ملا ہے۔ مس کا چھوٹا بیٹا مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے بہت پیارا ہے۔ اب اس کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ اس وقت چرخہ بھی بند ہو گیا ہے اس لئے قیدی عورتیں بالکل فارغ ہیں۔ بس دو تین کے پاس کشیدہ کا کام ہے پھر بھی لائن میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہم ابھی تک کام سیکھ رہی ہیں۔ آج مس سے کہہ کر جیل کی لائبریری سے سندھی تاریخ کی چار کتابیں منگوائی ہیں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۴-۸-۷۰

رات پونے گیارہ بجے

تھوڑی دیر پہلے رتنی باتیں کر کے گئی ہے۔ گھنٹہ بھر پہلے میں پڑھ رہی تھی۔ اچانک دیکھا کہ ایک نیم برہنہ لڑکی کچھ فاصلے سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دل کٹ سا گیا۔ عمر لگ بھگ پندرہ سال ہوگی۔ سانولا رنگ، تیکھی نظریں، پتلی سی ناک اور ٹھوڑی پر تل کا نشان، اس قدر پیاری اور معصوم لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں۔ میں نے خیریت پوچھی۔ شوہر کو زہر دینے کے الزام میں چودہ سال قید کی سزا ملی ہے۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح وہ زمیندار کے گھر میں کام کرتی تھی، کیسے زمیندار کے بیٹے کے ساتھ اس کے تعلقات پیدا ہوئے اور کیسے رشتے داروں نے کہیں اس کی شادی کروادی۔ وہاں سے وہ زمیندار کے بیٹے کے ساتھ بھاگی۔ پھر کسی طرح واپس آئی۔ ایک شوہر سے طلاق ملی اور ایک اور جگہ بیاہ دی گئی۔ آخر ایک دن زمیندار کے بیٹے نے اسے زہر لاکر دیا کہ اپنے شوہر کو مار دو تاکہ ہمیشہ کیلئے جان چھوٹ جائے۔ شوہر مر گیا اور یہ چودہ سال کی سزا بھگتنے یہاں پہنچ گئی۔

میں نے پوچھا ''تمہیں زہر بچو (زمیندار کا بیٹا) نے لاکر دیا تھا۔ پھر تم نے اس کا نام کیوں نہ لیا؟''

کہنے لگی ''بہن،! میں تو پھنس ہی گئی ہوں۔ اس کی جوانی کیوں خراب

کروں! خدا کرے خوش ہو! بس ایک بات کا دکھ ہے کہ اس دن کے بعد سے ملاقات تو ایک طرف اس نے کبھی خط بھی نہیں لکھا۔ بے وفا نکلا، مگر پھر بھی خدا کرے خوش رہے!''

میں نے پھر پوچھا ''تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ شوہر کو مار رہی ہو اس کا نتیجا کیا نکلے گا؟''

کہنے لگی ''مجھے تو آج تک پتہ ہی نہیں تھا کہ عورتوں کیلئے بھی جیلیں بنی ہوئی ہیں یا ان پر بھی مقدمے چلتے ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ اونچا اونچا ہنسنے لگی ''میں نے سوچا تھا کہ شوہر کو مار کر بچو سے شادی کے بعد وڈیرن بن جاؤں گی!''

آج صبح ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہمیں کہنے کے لئے آیا کہ ہم معافی نامہ لکھ کر آزاد ہو جائیں۔ ورنہ ہم لوگوں کا سال برباد ہو جائے گا کیونکہ جیل میں امتحان نہیں ہوتا۔'' پھر بولا ''سب لڑکوں نے معافی لکھ کر دے دی ہے۔''

ہم نے معافی نامہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا: ''پروا نہیں۔ سال برباد ہوتا ہے تو ہو جائے۔'' سوچا اگر ہم نے معافی مانگ لی تو ایک تو اس سے مارشل لاء والوں کا دماغ خراب ہو جائے گا، دوسرے ہماری آنے والی نسلیں ہم پر لعنت بھیجیں گی۔ ہم تو جیسے جڑ بنیاد ہیں، ہمارے نقش قدم پر چل کر بعد میں آنے والوں کو انقلاب لانا ہے۔ سندھی قوم کو نجات دلانی ہے۔ اگر ہم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا وہ یہ کہیں گے کہ ہم سے پہلے آنے والے بزدل تھے ایک سال کی سزا نہ بھگت سکے، منت سماجت کر کے بھاگ گئے۔ کسی قوم کی تقدیر بدلنا آسان کام نہیں۔ انقلاب خون مانگتا ہے۔ اسے ہزاروں انسانوں کی قربانی چاہئے۔ ابھی یہ دور بہت دور ہے۔ اگر ہم اس بازیچہ اطفال میں گر پڑے تو پھر آگے کیا ہوگا!

سینٹرل جیل، سکھر

۱۵-۸-۷۰

رات تقریباً دس بجے

آج سے میں ایک نئی ڈیوٹی پر لگادی گئی ہوں اور یہ ڈیوٹی ہے خط لکھنے کی۔ ہم سے پہلے یہاں کوئی بھی پڑھی لکھی قیدی نہیں تھی۔ کشور کو بھی صرف اردو پڑھنے آتی ہے مگر وہ لکھ نہیں سکتی۔ چنانچہ ہمارے آنے پر عورتوں نے مس کی منت سماجت کی: ''اسے کہو کہ ہمیں خط وغیرہ لکھ کر دے دیا کرے''، اس لئے آج مس نے مجھ سے کہا ''آج سے تمہارا کام خط لکھنا بھی ہے۔ ان عورتوں کے خط لکھ دیا کرو۔'' آج پہلے ہی دن میں نے پانچ خط لکھے۔ مائی کرماں تو کہتی ہے کہ مجھے شاہ لطیف سائیں کا ماروی والا پورا سر لکھ دو تاکہ میں اپنے بھائی کو بھیج سکوں۔ عورتیں کہتی ہیں ''تم تو پڑھی لکھی ہو، تمہیں تو دکھ درد لکھنے بھی آتے ہیں، خطوں میں اتنا درد بھر دو کہ وہ پڑھتے ہی ملاقات کیلئے دوڑے چلے آئیں۔'' میں سوچ رہی تھی کہ میری جگہ یہاں کوئی ادیب ہونا چاہئے تھا۔ یہ لوگ جو کچھ لکھوانا چاہتی ہیں وہ میں نہیں لکھ سکتی۔ ایک جملہ لکھوانے کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہیں۔ ایک گھنٹہ میں مشکل سے ایک خط مکمل ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں سال ہا سال کے دکھ بھرے ہوئے ہیں جنہیں وہ اپنوں تک نہیں بھیج سکیں۔ مس انہیں صرف خیریت کے دو الفاظ ہی لکھ کر دیتی تھی۔ یوں بھی وہ خوف کے مارے اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتی تھیں۔

آج کا دن بہت اچھا گذرا۔ اب ہم یہاں اس ماحول کی عادی ہو چکی

ہیں۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پچھلے کئی برسوں سے یہیں رہ رہی ہیں۔ کل مارشل لاء والے آ رہے ہیں اس لئے ہمیں قیدی لباس دے دیا گیا ہے۔ نسیم کا لباس اتنا بڑا ہے کہ اس میں آدمی پورے کا پورا چھپ جاتا ہے۔ سر پر اوڑھنے کیلئے چادریں ملی ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں انہیں دھویا کیسے جائے گا؟ کپڑے ملنے کی بھی انتہائی خوشی ہوئی ہے۔ انہیں پہننے کی خواہش کل پوری ہوگی۔

تھوڑی دیر پہلے ایک قیدی عورت کو دورہ پڑا ہے۔ عورتیں کہتی ہیں کہ اس پر سایہ کا اثر ہوا ہے مگر ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہسٹیریا کا دورہ ہے۔ آدھا گھنٹہ بیہوش پڑی رہی۔ اس کا نام بختاور ہے۔ ساری وارڈ کی سندھی عورتوں میں سب سے چالاک اور بات چیت میں بہت تیز طرار ہے۔ خاوند کو قتل کرنے کے جرم میں چودہ سال قید کی سزا کاٹ رہی ہے۔ سب عورتوں کا کہنا ہے کہ پورے وارڈ میں بختاور ہی واحد بے گناہ قیدی ہے۔ وہ خود بھی کہتی ہے کہ ''میں نے اپنے شوہر کو قتل نہیں کیا۔ پتہ نہیں کون مار کر گھر کے باہر دفن کر گیا۔ پولیس نے مجھے حراست میں لے کر تین دن تک الٹا لٹکائے رکھا۔ میرے ہاتھ چارپائی کے پایوں کے نیچے رکھ کر چارپائی پر چار پانچ آدمی بٹھا دئے جاتے تھے۔ میں بیہوش ہو جاتی تھی اور پھر ہوش میں آتے ہی تشدد شروع کر دیا جاتا تھا۔'' اسے سزا جرگے نے سنائی ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو صدر بنے گا تو وہ رہا ہو جائے گی اس لئے کہ وہ بالکل بے گناہ ہے۔ سوچتی ہوں انسان کیسے امید کے سہارے ساری ساری زندگی گذار دیتے ہیں۔ بختاور کو بھی امید ہے کہ ایک دن وہ ضرور آزاد ہو جائے گی۔'' پتہ نہیں کب بھٹو صدر بنے گا اور کب بختاور آزاد ہوگی؟

سینٹرل جیل، سکھر

۱۶-۸-۷۰

رات گیارہ بجے

آج بہت حبس ہے۔ گرمی اور مچھروں کی وجہ سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی۔ اس لئے کچھ عورتیں گا رہی ہیں اور کچھ کوئلے کے ساتھ زمین پر لکیریں کھینچ رہی ہیں۔ کنکروں سے وہ کوئی کھیل کھیل رہی ہیں جب کہ اس کھیل میں جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ انہیں میسر نہیں۔ میسر بھی کیسے ہوں یہ جیل ہے! آج کچھ فوجی افسران آئے تھے اس لئے آج صبح سے جیل میں ''دھڑا دھڑ'' مچی ہوئی ہے۔ ہم بھی اپنا نیا یونیفارم پہن کر باقاعدہ پکی قیدی عورتوں کی قطار میں بیٹھ گئی تھیں۔ آج مس بھی وردی میں آئی تھی۔ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گیارہ بجے فوج کے دو افسر سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ اندر آئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے ہمارے متعلق بتایا کہ بھوک ہڑتال کے سلسلے میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے ہم سے پوچھا ''تم یہاں خوش ہو یا باہر خوش تھیں؟'' میں نے جواب دیا کہ ''ہم یہاں بھی خوش ہیں اور باہر بھی خوش تھیں!''۔ پھر وہ بولا ''معافی لکھ کر دے دو!''۔ ہم نے کہا ''معافی تو ہم مرتے دم تک نہیں مانگیں گی''۔ اس کے علاوہ انہوں نے کسی اور سے کوئی خاص سوال جواب نہ کیا بی کلاس کا راؤنڈ لگا کر واپس چلے گئے۔

گھر سے کسی قسم کی اطلاع نہیں آئی بہت انتظار ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر نے بتایا کہ کئی لڑکوں نے معافی لکھ کر دے دی ہے۔ ہمیں ڈاکٹر کی بات پر یقین نہیں آیا۔ شاید یہ لوگ ہمیں اس لئے بار بار بتا رہے ہیں تا کہ ہم بھی معافی نامہ لکھ کر دے دیں۔

اب ہمیں جیل پسند آ گئی ہے۔تقریباً سب لوگوں کی ہم سے بن گئی ہے۔ خاص طور پر ہماری ہم عمر لڑکیاں تو ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ بار بار پوچھتی ہیں ''بہن اختر پڑھتی ہو؟ کتنا پڑھو گی؟ کون سی نوکری کرو گی؟'' بہت اچھی ہیں یہ سب۔ ایک لڑکی جس کا نام زینب ہے اس نے مجھے اپنی بہن بنالیا ہے۔عمر تقریباً اٹھارہ یا انیس سال ہوگی دبلی پتلی، لمبی، رنگ سانولا، بال اتنے لمبے اور گھنے ہیں کہ کیا بتاؤں۔شروع شروع میں وہ ہمیں دیکھ کر ناک منہ چڑھاتی اور ہماری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتی تھی جیسے کہتی ہو'' یہ دو جماعتیں پڑھی ہوئی ہو تو کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو۔ہم بھی کسی سے کم نہیں؟''۔ میں نے اس سے پوچھا ''کس کیس میں آئی ہو؟'' بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کمال لاپرواہی سے کہنے لگی ''سات خون کئے ہیں میں نے!''۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔میں نے کہا ''ایسا کیوں کیا؟ کن کو قتل کیا تھا تم نے؟'' کہنے لگی ''میری شادی میرے کزن کے ساتھ ہوئی۔ میرے بھائی کی دوستی قریب کے ایک گاؤں کی کسی لڑکی سے ہوگئی۔ایک دفعہ لڑکی کے بھائی نے دیکھ لیا، بہت ہنگامہ ہوا۔ آخر اس نے شرط رکھ دی کہ میرا بھائی اگر میری شادی اس سے کردے تو وہ اپنی بہن میرے بھائی کو دے دے گا۔بس اسی دن سے میرا بھائی میرے پیچھے پڑ گیا اور ہر وقت کہنا شروع کردیا کہ میں اپنے شوہر کو چھوڑ دوں۔ایک دن اس نے مجھے سفید پاؤڈر لاکر دیا کہ آٹے میں گوندھ کر اپنے گھر والوں کو کھلا دوں۔مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔میں کافی عرصہ انکار کرتی رہی مگر بھائی نے میرا جینا حرام کردیا تھا۔آخر ایک دن میں نے وہ پاؤڈر آٹے میں گوندھ کر روٹی پکادی۔اس دن اچانک میرا دوسرا بھائی بھی آ گیا۔میری ساس اس کیلئے کھانا مانگنے آئی! بس پھر تو میں پھنس گئی! روٹی میرے بھائی نے بھی کھانی تھی۔اب کیا کروں؟ گھر میں اور آٹا بھی نہیں تھا۔میں نے کھانا تو دے دیا لیکن بھائی کو بلا کر کہا کہ وہ اس وقت کھانا نہ کھائے، میں آٹا منگا کر پکادوں گی

اس لئے وہ کھانا بعد میں کھالے لیکن میرے بھائی نے کہا ''میں جلدی میں ہوں۔ دو نوالے کھالیتا ہوں'' بس پھر کیا تھا۔ جیسے جیسے وہ کھانا کھاتے گئے ویسے ویسے میری سانس پھولتی گئی۔ کھانا کھانے کے پانچ منٹ بعد میرا بھائی، سسر، ساس، شوہر، دو دیور، نند سب چیخیں مارتے ہوئے بیہوش ہوگئے۔ میں نے چیخنا شروع کردیا آخر پولیس آ گئی۔ وہ سب مرگئے اور مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ میرا بھائی جس نے مجھے زہر لا کر دیا تھا، مجھے قسمیں دینے لگا: 'میرا نام مت لینا۔ میں مسکین بال بچے دار مرجاؤں گا، تم پر الزام آیا تو تمہیں رہا کروالوں گا۔'' مجھے اس پر رحم آ گیا۔ میں نے اقبال جرم کرلیا۔ میں نے عدالت میں بیان دیا کہ میرا خاوند مجھ پر تشدد کرتا تھا، ساس اور سسر کا رویہ بھی ٹھیک نہیں تھا اس لئے میں نے انہیں زہر دے دیا میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں کسی اور کے ساتھ خراب تھی۔ مجھے سزا دے دی گئی۔ میرے بھائی نے کبھی خط تک نہیں لکھا۔ وہ لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ میں خراب تھی۔ ہم ایسی بہن کا کیا کریں گے؟ ہمارے لئے وہ مرگئی ہے! خدا کرے وہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہو مگر مجھے زندگی بھر اس بے ایمانی کا دکھ رہے گا۔ اگر زندگی رہی تو قید پوری کر کے نکل جاؤں گی۔'' میں نے پوچھا ''کہاں جاؤ گی؟''۔ کہنے لگی '' کچھ پتا نہیں کہاں جاؤں گی لیکن مجھے اس وقت فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے، ابھی تو سزا میں نو سال پڑے ہیں۔''

آج سارا دن زینب کا چہرہ اور آنکھیں میرے سامنے گھومتی رہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کتنی معصوم اور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں والی زینب جیسی لڑکیاں اپنے معصوم ہاتھ خون سے رنگیں گی یہاں آئیں گی اور اپنی ساری عمر ان سلاخوں کے پیچھے گذار دیں گی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۷-۸-۷۰

رات ساڑھے نو بجے

آج شام شدید آندھی آئی۔ ہم باہر باورچی خانے میں بیٹھی تھیں کہ اچانک آسمان آندھی اور کالے بادلوں سے بھر گیا اور ہر طرف دھول اڑنے لگی البتہ بارش نہیں ہوئی۔ باورچی خانے والیوں نے آٹے کو ڈھانپ دیا اور ترکاری اندر اٹھا کر لے گئیں۔ بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ یہاں جیل میں عورتیں کہتی ہیں کہ ''سکھر کو بددعا لگی ہے کہ یہاں صرف گرد اڑتی ہے، بارش نہیں پڑتی''۔ جو قیدی عورتیں تھر کی رہنے والی ہیں، وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی ہیں ''یہ بادل ہمارے دیس میں برس کر آرہے ہیں۔'' رتنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی ''اس موسم میں ہم کبھی گھر میں نہیں بیٹھتی تھیں'' تیز ہوا سے سی کلاس میں لگا ایک آم کا درخت گر گیا۔ سب عورتوں نے اس کی شاخیں کاٹ کر موسم سرما کی آگ جلانے کیلئے لکڑیاں اکٹھی کر لی ہیں۔

آج نسیم مجھ سے ناراض ہو کر سونے چلی گئی ہے۔ باہر میدان میں اماں نوراں (میٹرن) اور دوسری قیدی عورتیں بیج لگا رہی ہیں۔ اماں نوراں کو سب چھوٹی اماں کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے، ٹھیٹھ سندھی ہے۔ وہ قد کی چھوٹی ہے اس لئے سب اسے چھوٹی کہتے ہیں۔ کپڑے پہننے کے معاملے میں وہ دوسری میٹرنس سے زیادہ اجلی اور صاف ستھری ہے۔ کبھی کسی سے کوئی پیسہ نہیں مانگتی اور نہ ہی

کسی کو بے جا تنگ کرتی ہے۔لیکن آج میں گلاس ڈھونڈتی ہوئی باورچی خانے میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ چھوٹی اماں کچھ روٹیاں چرا کر قمیض کے نیچے اپنی پشت پر باندھ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں چپ سادھے وہیں کھڑی رہی۔ مجھے دیکھ کر اماں گھبرا سی گئی اور پھر ہنس کر کہنے لگی ''بیٹی اختر کیا کروں، بیچاری قیدی عورتوں کا بھلا کر رہی ہوں ورنہ اس لال آٹے کی آدھی کچی آدھی پکی روٹیاں کھانے کا کسے شوق ہے۔'' اماں کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں اماں خانی (جو روٹی انچارج ہے اور شوہر کے قتل کے مقدمے میں بیس سال سزا یافتہ ہے) کچھ اور روٹیاں لے کر آئی اور چھوٹی اماں کو دے کر کہنے لگی ''لو یہ روٹیاں اماں بی بی جان (میٹرن) کی ہیں۔تم جاؤ تو اسے دے دینا۔'' اس وقت میں خاموش رہی لیکن میں سوچ رہی تھی کہ یہ میٹرنس آٹھ آٹھ، دس دس روٹیاں کیوں لے جاتی ہیں؟ پوچھوں تو کس سے؟ اس لئے کہ تمام میٹرنس حتیٰ کہ قیدی عورتیں بھی ہم سے بہت کتراتی اور ہمیں شک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔آپس میں باتیں کرتے کرتے ہمیں دیکھ کی چپ سادھ لیتی ہیں۔ میں نے نسیم سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ہمیں اصلی بات جاننے کی شدید کرید لگ گئی۔

آخر شام کو میں نے حوصلہ کر کے اماں سے پوچھ ہی لیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بتانے لگی ''ہمیں مس نے تمہارے بارے میں کہا کہ تم لوگ جاسوس ہو اس لئے تمہارے سامنے کوئی بھی بات نہ کی جائے۔تم قسم کھاؤ کہ اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کروگی۔'' اماں کے بات سن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور مس کے جھوٹ بولنے پر تعجب بھی ہوا۔ اماں نے بتایا ''یہاں پر سب قیدی عورتیں روٹیاں بیچتی ہیں یہ روٹیاں میٹرنس لے لیتی ہیں۔ اگر ہر روز ایک روٹی دی جائے گی تو جنہیں مہینے میں ایک

صابن ملتا ہے، انہیں کپڑے دھونے کے لئے صابن کی ایک ٹکیہ بھی ملے گی اور جنہیں بیڑی کی ضرورت ہوتی ہے انہیں ایک بنڈل بیڑی کا بھی ملے گا۔'' میں نے پوچھا ''کیا عورتوں کو بھوک نہیں لگتی؟''۔ اس پر اماں بولی ''وہ بھی مجبور ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ساری گرمیاں تنگ رہتی ہیں، کیونکہ کپڑے دھونے اور نہانے کیلئے ہر ہفتے آدھی چھٹانک سوڈا ملتا ہے اس لئے اس سے اتنے موٹے دو کپڑوں کا جوڑا نہیں دھویا جا سکتا۔ پھر نہائیں کیسے؟ اس لئے وہ اپنے حصے کی روٹی بیچ کر ایک عدد صابن کی ٹکیہ کے ساتھ مہینہ گزارتی ہیں۔ اس صابن سے ہفتے میں صرف ایک بار نہاتی ہیں اور روزانہ بغیر صابن کے ہی نہا کر گزارا کرنا پڑتا ہے۔''

میں نے حساب لگایا کہ ہر قیدی عورت کو روزانہ آدھا کلو آٹا ملتا ہے۔ جس میں سے چار روٹیاں پکتی ہیں۔ دو صبح کو ملتی ہیں اور دو شام کو۔ اس حساب سے ایک روٹی آدھا پاؤ آٹے کی ہوتی ہے اور اس کی کل قیمت پانچ پیسے بنتی ہے۔ اس حساب سے مہینے کے دو روپے پانچ پیسے بنتے ہیں جبکہ میٹرن انہیں مہینے میں پچاس پیسے (کا صابن) دیتی ہے۔ کتنا فرق ہے! بیچاری مجبور قیدی عورتیں اپنے پیٹ کو اذیتیں دے کر، روٹی بیچتی ہیں جبکہ میٹرن ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ پکی پکائی روٹی پا کر بھی میٹرنس کہتی ہیں کہ وہ ان پر احسان کر رہی ہیں۔ مس کو اس بات کا علم ہے لیکن اس کا کہنا ہے ''تم جانو اور میٹرنس جانے مجھ سے کوئی شکایت نہ کی جائے۔ تاکہ میں حلفیہ کہہ سکوں کہ مجھے کسی بات کا علم ہی نہیں۔'' اگر مس چاہے تو سپرنٹنڈنٹ کو کہہ کر عورتوں کیلئے صابن کا انتظام کروا سکتی ہے یا قیدیوں کے منہ سے ہی کہلوا سکتی ہے لیکن یہاں مس کی اجازت کے بغیر سپرنٹنڈنٹ سے کوئی شکایت بھی نہیں کی جا سکتی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۸-۸-۷۰

رات کے بارہ

ابھی ابھی محفل موسیقی ختم ہوئی ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ میٹرنس نے شور مچایا تب جا کر ہم خاموش ہوئیں۔ ابھی تک مریم کا گایا ہوا گانا دل کو چھو رہا ہے ''تیرے ہتھاں دیاں انگلیاں، میڈے سونے دی سلکیاں میڈا پردیسی لاڈلا، تیری بالک پیاری لاگے رے'' اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ آواز سے زیادہ اس کے گانے کا انداز کہیں زیادہ اچھا ہے۔ یہ معصوم، بچی لڑکیاں جنہیں ہماری اس دنیا کی فریب کاری، چالاکی اور بدمعاشی کی کوئی خبر نہیں، اتنی تکلیفیں اور دکھ اٹھا کر بھی مکمل سرخوشی سے بھرپور ہیں۔ مریم کو جیل میں ساتواں سال ہے۔ اسے شوہر کے قتل کے مقدمے میں بارہ سال کی عمر میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ذات کی کولھن ہے۔ ماموں کے لڑکے کے ساتھ پیار تھا، اس نے اس کے شوہر کو مار دیا۔ جیل آ کر مسلمان ہوگئی۔ رحم کی درخواست مسترد ہوگئی اور پھانسی پر چڑھنے کی تاریخ بھی آ گئی تھی۔ سکھر جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے صدر کو لکھ بھیجا ''لڑکی مسلمان ہوگئی ہے اور بہت کم سن ہے۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے معافی دے دی جائے۔'' اس زمانے میں صدر ایوب خان غیر ملکی دورے پر گئے ہوئے تھے اور سپیکر عبدالجبار قائم مقام صدر تھے۔ انہوں نے لکھ کر بھیجا کہ ''مسلمان ہو جانے کی وجہ سے اسے معافی دی جاتی ہے۔'' اس بات کی اطلاع اسے عید کی رات کو ملی۔ (پھانسی کی سزا) بیس سال قید میں تبدیل ہوگئی۔ ان میں

سے سات سال وہ پورے کر چکی ہے۔ خدا جانے اور کتنی قید کاٹے گی۔ میں نے پوچھا ''جب تمہاری ساری درخواستیں رد ہوگئیں اور تمہارا پھانسی کا دن بھی مقرر ہو گیا تو تم کیا محسوس کر رہی تھیں؟۔'' بولی ''مجھے بچ جانے کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پھانسی ہو جائے گی۔ میں سارا دن کال کوٹھڑی میں پڑی روتی رہتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا تختہ گھومنے لگا تھا۔ روز خواب دیکھتی تھی کبھی دیکھتی کہ وہ مجھے لے کر جا رہے ہیں، کبھی دیکھتی کہ وہ میرا منہ کالے کپڑے سے ڈھانپ رہے ہیں۔ کبھی دیکھتی کہ میری آنکھیں باہر نکل آئی ہیں۔ میں نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا اور جب مجھے معافی کی خبر ملی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔''

مریم کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی۔ اسے معافی صرف اس وجہ سے مل گئی کہ وہ مسلمان ہوگئی تھی۔ یہاں رحم انسانوں پر نہیں صرف مسلمانوں پر کیا جاتا ہے۔

آج گھر سے منی آرڈر آیا تو میں نے چینی، گھی اور صابن منگوایا۔ آج بھی میں نے بہت سے خط لکھے۔ نل پر ابھی تک عورتیں نہا رہی ہیں۔ چاندنی رات میں عورتوں کے قہقہوں، نہانے کی شور اور نل کی گھڑ گھڑ سن کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم گھر میں ہوں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۹-۸-۷۰

رات سوا نو بجے

تھوڑی دیر پہلے میں ابھی آ کر بیٹھی ہی تھی کہ میری ایک بزرگ شاگرد اماں غلام فاطمہ مجھ سے سبق لینے آئی۔ بہت دلچسپ عورت ہے۔ باتیں بہت عجیب و غریب کرتی ہے۔ جیل میں آ کر قرآن پڑھا ہے اور اب ''نورنامہ'' پڑھ رہی ہے۔ لفظ لفظ کر کے یاد کر رہی ہے۔ اس ضعیف عورت کو یوں اردو کے ایک ایک لفظ پر محنت کرتے دیکھ کر خیال آیا کہ چھوٹی عمر میں ہم بھی یوں محنت کیا کرتی تھیں۔ وہ کبھی مجھ سے اور کبھی نسیم سے سبق لیتی ہے۔ اسے ٹی-بی کی بیماری ہے، اس لئے اسے جو راشن ملتا ہے، جو چائے کی پتی ملتی ہے وہ میٹرنس یا قیدیوں کے ہاتھ بیچ دیتی ہے۔ ایک دو ماہ تک رہا ہونے والی ہے۔ کہتی ہے کہ ''مجھے سزا دے کر حکومت بہت خوش ہوئی ہوگی! مجھے تو خود یہاں آ کر سرکاری خرچ پر نورنامہ اور قرآن پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ دو چار بکرے کھائے ہیں دو چار مہینے دودھ پیا ہے۔ خواہ حکومت کا اس میں نقصان ہوا ہو! میں بھی جاتے وقت صاحب کو سلام کر کے کہوں گی: ''تمہاری بڑی مہربانی جو روٹی پانی کھلاتے رہے! مگر اس گوشت اور دودھ کے بدلے رہائی کے وقت دو چار بکرے اور بھینسیں دے دو تو بہت اچھا ہو!۔''

ہمیں ملاقات کا شدت سے انتظار ہے۔ بہت خوشی ہوگی اگر اماں اور بھائی رسول بخش ہمیں آ کر قیدیوں کے لباس میں دیکھیں۔ کپڑے بہت موٹے ہیں اس

لئے سارا جسم دانوں سے بھر گیا ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔ آج بھی عورتوں کو خط لکھ کر دئے۔ لائن سے آنے کے بعد باورچی خانے میں بیٹھتی ہیں۔ بہت مزا آتا ہے۔ آم کے درخت کے نیچے دو مٹی کے چولھے بنے ہوئے ہیں۔ ایک پر دال کی ہنڈیا چڑھی ہوئی ہے اور دوسرے پر روٹی پک رہی ہے۔ روٹی پکانے کے لئے تین لڑکیاں ہیں، جن میں سے ایک بنگالن ہے، اس کا نام مریم ہے۔ دوسری کا نام شہناز ہے، بہت کم سن ہے مہاجر لڑکی ہے۔ چوری کے مقدمے میں تیسری مرتبہ جیل آئی ہے۔ کچی قیدی ہے اس کا کیس چل رہا ہے۔ تیسری کا نام ہیراں ہے۔ اس نے ساس کو قتل کیا ہے۔ چودہ سال کی قید ہے۔ جیل آ کر مسلمان ہوئی ہے۔ مریم پیڑے بناتی ہے، شہناز بیلتی ہے اور ہیراں پکاتی ہے۔ مجھے انہیں یوں کام کرتے دیکھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ آدھی روٹی توے پر پکا کر آدھی کوئلوں پر سینکتی ہے۔ سینکی روٹی کھانے میں لذیذ ہوتی ہے۔ کئی عورتیں اس وقت اپنی روٹیاں روکھی ہی کھا لیتی ہیں۔ سالن اماں خانی پکاتی ہے اور دوسرے سامان کا چارج بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تقریباً پانچ بجے کھانا تیار ہوتا ہے۔ آج اماں کا خط آیا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۰-۸-۷۰

رات گیارہ بجے

آج ہماری پہلی ملاقات آئی۔ اماں، بھائی، اسلم، مسعود اور ایاز آئے۔ خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آج کوئی ملاقات کیلئے آئے گا۔ آج خانزادی کی ملاقات بھی آئی تھی۔ خانزادی ہمارے ساتھ اکٹھی کھاتی پیتی ہے۔ کبھی وہ بی کلاس میں چلی جاتی ہے اور کبھی سی کلاس میں آجاتی ہے۔ آج وہ پھولے نہیں سمارہی۔ نسیم کی طبیعت خراب تھی، ہم مس سے چھٹی لے کر ہسپتال چلی گئیں۔ نسیم سوگئی اور میں بیٹھ کر پڑھنے لگی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ راشن آنے کا وقت تھا اس لئے میں سمجھی کہ شاید راشن آیا ہوگا مگر اچانک مجھے بہن واورگی کی آواز آئی ''اختر! اختر!'' اسی کے پیچھے تاج بھی ''اختر! اختر!'' کرتی دوڑتی آئی۔ ''اختر تیری ملاقات'' کا سنتے ہی میں نسیم کو اٹھائے بغیر دوڑتی ہوئی سی کلاس کی طرف بھاگی۔ آدھے راستے میں یاد آیا کہ بدحواسی میں نہ تو میں نے چادر لی ہے اور نہ ہی جوتی پہن کر آئی ہوں۔ بھاگ کر میں نے چادر اوڑھی۔ تب تک نسیم کو بھی بہن واورگی نے اٹھا دیا سو وہ بھی میرے پیچھے پہنچ گئی۔ سامنے کیا دیکھتی ہوں کہ اسلم اور مسعود (میرے بھائی) کھڑے ہیں۔ میں باری باری سب سے ملی۔ پشنو (چھوٹا بھائی ایاز) تو مجھے اتنا اچھا لگ رہا تھا اور میں اسے اتنی شدت سے چومنے لگی کہ وہ تنگ آکر میری گود سے اتر کر اماں کے پاس چلا گیا۔ میں نے حال احوال دریافت کئے۔ ہمارے سر پر دو میٹرنس کھڑی تھیں۔ ایک طرف جیلر اور مس بیٹھی تھی۔ میں اماں کو وارڈ گھمانے لے آئی۔ ایاز یہاں بھی گلہری پکڑنے میں لگ گیا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا ''زینا! مجھے گلہری پکڑ کر دو!''

میں نے وعدہ کیا کہ جب دوسری بار آؤ گے تو پکڑ کر رکھوں گی۔ جو سامان لکھا تھا وہ سب کا سب پہنچ گیا۔ کچھ فروٹ بھی لائے تھے۔ حکام نے بہت سا سامان لینے ہی نہیں دیا۔ میں سامان اٹھا کر ہسپتال آ گئی۔ ادھر آپا برکت بیٹھی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی ''اختر اس میں سے آدھا فروٹ اور کچھ دوسری چیزیں مس کو اور ساری میٹرنس کو بھی دو۔'' میں نے حیرت سے کہا ''میٹرنس اور مس کو کیوں دیں؟ اس کی بجائے ان قیدی عورتوں کو کیوں نہ دیں۔ جن بیچاریوں نے یہ چیزیں کبھی کھائیں تو کیا، دیکھی تک نہیں ہیں'' وہ مجھے سمجھانے لگی ''اختر یہ مجبوری کی جگہ ہے۔ یہاں ایسے ہی کرنا چاہئے۔ یہ میٹرنس تمہیں جینے نہیں دیں گی۔ تم پر تو مصیبت آئے گی ہی، یہ ہمارا جینا بھی حرام کر دیں گی۔ میٹرنس کہیں گی ''لڑکیاں تمہارے ساتھ ہیں تم نے انہیں کیوں نہیں بتایا؟۔'' اتنے میں کچھ اور عورتیں بھی آ گئیں اور انہوں نے بھی اس طرح کرنے کو کہا ''مس افسوس کرے گی کہ لڑکیوں کی ملاقات آئی اور انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا، اس لئے جا کر دے دو!۔'' میں سارا سامان رکھ کر وہیں پر خاموش بیٹھ گئی۔ پھر وہ سب عورتیں میرے پیچھے پڑ گئیں اور کہنے لگیں ''اختر، تمہیں یہاں ایک دن نہیں بلکہ پورا ایک سال رہنا ہے۔ یہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی ملاقات آئی ہو اور مس اور میٹرنس کو کچھ نہ دیا گیا ہو۔ اگر تم نے انہیں کچھ نہ دیا تو ہم بھی کچھ نہیں کھائیں گی۔ یا پھر ہم فروٹ میں سے آدھا حصہ دے آتی ہیں۔'' میں نے کہا ''ٹھیک ہے، مس اگر مانگے گی تو میں دے دوں گی۔'' وہ کہنے لگیں ''پگلی مس خود نہیں مانگتی یہ تو تمہیں سوچنا چاہئے۔'' آخر میں نے کچھ فروٹ اور ایک صابن کی ٹکیہ اٹھائی اور آپا برکت سے کہا ''مس کو دے آؤ۔'' وہ بولی ''پاگل مس کو اس طرح سیدھا نہیں دیتے۔ تاج مس کی اردلی ہے وہ خود ہی مس کی ٹوکری میں ڈال دے گی۔'' میں ساری بات سمجھ گئی کہ مس کا معیار ذرا اونچا ہے اس لئے وہ صابن، چینی یا کوئی اور دوسری چیز خود کیسے

لے سکتی ہے؟ بس گھر جا کر ٹوکری میں سے نکال لے گی! تاج نے چپ چاپ سامان ٹوکری میں ڈال دیا۔ میں نے میٹرنس کو بھی تھوڑی چینی، کپڑے دھونے کے صابن کی ایک ایک ٹکیہ اور کچھ پھل دے دیا۔ سوائے چھوٹی اماں کے سب باری باری مانگنے کے لئے آئیں۔ جیسے قرض لینے آئی ہوں۔ میں سوچنے لگی کہ ہماری ملاقات جو جلدی جلدی آئے گی اور ہماری سزا بھی کم ہے اس لئے کوئی بات نہیں، لیکن بیچاری دوسری قیدی عورتوں کے لئے تو بڑی مشکل ہوتی ہوگی جن کی ملاقات مشکل سے سال دو سال میں ایک بار آتی ہے۔ دور دراز سے آنے والے بیچارے مسکین لوگ، سینکڑوں میلوں کا سفر کر کے، بچوں کو بھوکا مار کر، کرائے خرچ کر کے، پائی پائی جوڑ کر، پتہ نہیں کیسے ایک سیر گڑ یا چینی، صابن کی دو چار ٹکیاں یا ایک سیر گھی لے کر آتے ہوں گے۔ وہ سب کچھ تو یہ بلائیں ہڑپ کر جاتی ہوں گی، بیچاری قیدی عورتوں کے لئے کیا بچتا ہوگا؟ ان کے غریب رشتہ دار کیا جانیں کہ جن کے لئے وہ اتنی بھوک کاٹ کر، پیسہ پیسہ جوڑ کر اتنی محبت کے ساتھ یہ چیزیں لے کر جا رہے ہیں انہیں تو شاید چکھنا بھی نصیب نہ ہو۔

ملاقات کے بعد میں اور نسیم سارا دن ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہیں۔ سارا دن سب کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے۔ بھائی بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اسلم اور انی (مسعود) جن کے ساتھ میں سارا دن لڑتی تھی، اس وقت بہت اچھے لگ رہے تھے۔ کاش وہ لوگ واپس ہی نہ جاتے۔ عجیب قسم کی خوشی اور دکھ کا ملا جلا احساس تھا۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۱-۸-۷۰

رات ساڑھے نو بجے

آج میں سارا دن پڑھتی رہی۔ یکم ستمبر سے امتحان ہونے والے ہیں۔ سارا سال پڑھا نہیں ہے اب بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ایک دن بھی کلاس میں نہیں جا سکی۔ کبھی جیل میں تو کبھی ریل میں۔ یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ بہت زیادہ لڑکیاں ڈگری لئے بیٹھی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے انہیں یا دوسروں کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

امیر لڑکیوں کیلئے پڑھنا تو جیسے ایک تفریح ہے۔ وہ تو کالج میں جیسے دل بہلانے آتی ہیں، کیونکہ انہیں پڑھ کر نہ تو کوئی نوکری حاصل کرنی ہے اور نہ ہی اپنی تعلیم کو کسی خاص مقصد کیلئے استعمال کرنا ہے۔ اگر نوکری کرتی بھی ہیں تو ان میں سے اکثر تو فیشن کے لئے یا تحفے تحائف دینے اور فلمیں دیکھنے کیلئے کرتی ہیں۔ باقی جو غریب لڑکیاں ہیں وہ خدا جانے کتنی بڑی بڑی فیسیں دے کر پڑھتی ہیں وہ اس لئے تعلیم حاصل کرتی ہیں کہ نوکری کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں مگر انہیں نوکری بھی نہیں ملتی کیونکہ اس ملک میں نوکری حاصل کرنے کے لئے رسائی اور اثر و رسوخ چاہئے۔ ویسے بھی سندھی لڑکیاں تدریس کے علاوہ کسی اور شعبے میں جاتی ہی نہیں ہیں۔ حیدرآباد کے پرائمری سکولوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک جائزہ لیا جائے تو اساتذہ اور لیکچرارز کی اکثریت، بڑے بڑے افسروں، بیوپاریوں اور زمینداروں کی بیٹیوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے کیونکہ یہ رشوت بھی دے سکتی ہیں اور اپنے عزیزوں کے اثر و رسوخ کے ذریعے نوکریاں بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ گویا بڑا زمیندار، سرمایہ دار اور افسروں کا طبقہ ہر قسم کے مالی وسائل پر قابض ہے۔ اس لئے وہ سو دو سو تک کی نوکری بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ کہیں کسی مسکین کے گھر دو وقت کی روٹی نہ پک جائے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۲-۸-۷۰

رات ساڑھے دس

ابھی ابھی باہر کوئی قیدی عورت گا رہی تھی:

سورج ڈوب گیا، اندھیرا ہوگیا، پرندے گھروں کو لوٹ آئے
ان میں سے کچھ نے تو موتی چُنے لیکن میں نے چنے تنکے
اب پروردگار ایسے پر دے کہ اڑ کر اپنی منزل تک پہنچوں۔

خاموشی میں یہ آواز بازگشت کی طرح گونج رہی ہے۔ یہ عورتیں پل پل اپنے گاؤں، اپنے عزیزوں اور اپنے بچوں کو یاد کرتی ہیں۔ اگر گرمی آجائے تو کہیں گی ''ایسی گرمی میں ہم کپاس چنتی تھیں۔'' ''دس دس بار غسل کرتی تھیں، پیالوں کے پیالے لسی پیا کرتی تھیں۔'' گویا ہر موقعے پر گذرے وقت کو یاد کرتی ہیں۔ ان کی پہاڑ جتنی سزاؤں کا سوچ کر اور ان کی باتیں سن کر مجھے رونا آجاتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں ایسا کون سا طریقہ ہو کہ یہ سب آزاد ہو جائیں؟۔ اس دن اخبار میں پڑھا کہ مغربی پاکستان میں سیلاب آیا ہوا ہے اور ایک شہر مکمل ڈوب گیا ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی اس لئے اس شہر کی جیل کے دروازے کھول دئے گئے اور قیدیوں سے کہا گیا ''بھاگو! جا کر اپنی زندگیاں بچاؤ۔'' جب یہ خبر یہاں قیدی عورتوں نے سنی تو سب بہت خوش ہوئیں اور بولیں: ''ہم تو یہاں قید ہیں لیکن چلو، ہم جیسے کچھ مجبور لوگ تو

آزاد ہوئے!۔'' میں نے کہا ''یہ کیسی آزادی ہے؟ باہر چاروں طرف پانی ہے، بھوک ہے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی بچ سکے!۔'' وہ کہنے لگیں ''جیل سے تو یہ مرنا کہیں بہتر ہے۔ کم از کم آزاد تو مریں گی!'' پھر وہ سارا دن آپس میں باتیں کرتی اور دعائیں مانگتی رہیں کہ خدا کرے سکھر کے دریا میں بھی سیلاب آجائے اور یہاں کے دروازے بھی کھول دئے جائیں! یا کوئی طوفان آجائے یا جنگ چھڑ جائے اور پھر بم گریں جیل کی دیواریں اڑ کر گر جائیں اور ہم سب نکل بھاگیں۔ پھر وہ کہنے لگیں ''اگر اس وقت ہمیں کہا جائے تم آزاد ہو تو ہم جس حال میں ہیں جہاں بیٹھی ہیں، اسی طرح اٹھ کر دوڑ پڑیں گی اور پلٹ کر بھی نہ دیکھیں گی تا کہ یہ پھر ہمیں گرفتار نہ کرلیں!۔'' میں ان کی باتیں سن کر سوچنے لگی کہ انہیں واقعی اس طرح سوچنا چاہئے۔ بیس بیس سال کی سزا اور ان برسوں میں باہر کتنی تبدیلیاں آجائیں گی، کتنے انقلاب آجائیں گے، کتنی نئی زندگیاں وجود میں آجائیں گی اور کتنی ختم ہوجائیں گی۔ چھوٹے بچے بڑے ہوجائیں گے، جوان بوڑھے ہوجائیں گے۔ کتنی عیدیں گذریں گی، خوشیاں ہوں گی، غم ہوں گے، کتنی بہاریں آئیں گی، سردیوں اور گرمیوں کے کتنے موسم گذر جائیں گے۔ کتنے گاؤں شہروں کی صورت اختیار کرلیں گے، کتنے شہر بڑے صنعتی مراکز میں تبدیل ہوجائیں گے۔ نئے کارخانے، ملیں، اسکول، کالج، بازار کھل جائیں گے۔ نئی سائنسی دریافتیں ہوں گی۔ دنیا کے کتنے غلام ملک آزاد ہوجائیں گے۔ کتنے ملکوں میں انقلابی تحریک شروع ہوجائے گی۔ ممکن ہے کوئی بڑی جنگیں چھڑ جائیں، بڑی تباہیاں ہوں، کتنے سیلاب بیماروں اور دکھی لوگوں کو نوالہ بنالیں مگر یہیں، اسی چھوٹے سے وارڈ میں پڑی ہوں گی! انہیں خبر تک نہ ہوگی کہ باہر کیا کچھ ہوگیا؟ ان کی یہی دنیا ہوگی۔ لیپائی، کشیدہ کاری، راشن، آٹا تولنا اور پکانا، یہی دال کی دیگ اور چائے!

سینٹرل جیل، سکھر

۲۳-۸-۷۰

رات پونے گیارہ بجے

آج اتوار کا دن تھا اور جیل کی چھٹی تھی۔ اس لئے ہم دیر سے اٹھیں۔ اتوار کے دن تمام بی کلاس میں لپائی ہوتی ہے۔ لپائی کیلئے رتنی، دادلی اور دوسری تین چار عورتیں مقرر ہیں۔ رتنی لپائی کرتی ہے، دادلی پانی ڈالتی ہے اور دوسری سب پانی بھرتی ہیں۔ آج میں نے اور نسیم نے بھی لپائی کی۔ شروع میں تو ہم سے لپائی والی لکڑی چلتی ہی نہ تھی مگر آہستہ آہستہ ہم سیکھ گئیں۔ تھکن بھی بہت ہوئی اور مزہ بھی بہت آیا۔ اس وقت پٹھوں اور بازوؤں میں بہت درد محسوس ہو رہا ہے۔ لپائی کے بعد سوڈے میں کپڑے دھوئے تھے۔ اتوار کے دن سارے وارڈ میں افراتفری مچی ہوئی ہے۔ کہیں بستر پڑے ہیں تو کہیں چارپائیاں، کوئی پھٹے کپڑے سی رہی ہے تو کچھ پڑی سو رہی ہیں۔ ہر اتوار کو سوڈا اور تیل ملتا ہے۔ ہم چھ ملکر سوڈا اور تیل ساتھ لیتی ہیں۔ آج میں اور نسیم لینے گئی تھیں۔ تیل اور سوڈا اماں راستی (مقدم) بانٹتی ہے۔ وہ قیدیوں کا حساب کرنے کے بعد بڑی سی چادر بچھا کر ایک ایک مٹھی بھر کر رکھتی جاتی ہے۔ اس نے قیدیوں کی تعداد سے پانچ ڈھیریاں زیادہ رکھ دیں۔ میں نے پوچھ لیا کہ یہ پانچ ڈھیریاں زیادہ کیوں ہیں؟'' وہ بتانے لگی کہ یہ پانچوں میٹرنس کے لئے ہیں۔ پتہ چلا کہ میٹرنس بھی قیدیوں کے سوڈے اور تیل سے اپنا حصہ وصول کرتی ہیں۔ ویسے سرکاری طور پر انہیں سوڈا اور تیل نہیں ملتا۔ سوڈے کی مقدار دیکھ کر میں سوچنے لگی

کہ اس سے تو ایک چادر بھی نہیں دھل سکے گی اور اس پر میٹرنس کا حصہ بھی نکالنا ہے۔ سارے ہفتے کا تیل مشکل سے ایک تولہ بھی نہ ہوگا۔ عورتوں کے لمبے گھنے بال دیکھ کر میں نے تیل کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بار آدھے بالوں کو لگانے جتنا بھی نہ تھا۔ سو سارا ہفتہ کیسے پورا ہوگا۔ بچوں کیلئے ہر ہفتے کپڑے دھونے کی ایک ایک ٹکیہ دیتے ہیں۔ ہمارے وارڈ میں چار بچے ہیں مگر اماں راستی نے دو بچوں کی ماؤں کو ایک ایک ٹکیا صابن کی دی اور دو ٹکیاں بہن پٹھانی کو جا کر دے دیں۔ میں نے ایک بچے کی ماں سے پوچھا ''تمہیں صابن کب ملتا ہے؟'' تو اس نے بتایا ''ایک ہفتے میں دو بچوں کو صابن ملتا ہے اور دوسرے ہفتے میں دوسرے دو بچوں کو۔'' پوچھنے پر پتہ چلا کہ ہر ہفتے دو ٹکیوں سے مس کے ''بچوں'' کے کپڑے دھلتے ہیں۔

آج دوپہر کو اماں مہلاں کا تین سالہ بچہ علی خان باورچی خانے سے کھانا لینے آیا تو اماں خانی نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''بیٹا، تم ایک روٹی کھا چکے ہو، باقی ایک تمہاری ماں کیلئے رکھ رہی ہوں۔'' میں نے اماں خانی سی کہا ''ایک کیسے ہوئی؟ بچوں کے لئے ایک وقت کی ایک روٹی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک علی خان کی بھی ہوئی اور دو اس کی ماں کی ہوئیں سو کل ملا کر ہوگئیں تین روٹیاں۔ جن میں سے ایک وہ کھا چکا باقی دو ہونی چاہئیں۔'' وہ کہنے لگی ''بی بی، علی خان کی صبح اور شام کی دونوں روٹیاں ٹکڑوں میں جاتی ہیں۔'' میں نے پوچھا ''کیسے ٹکڑے؟'' وہ بتانے لگی ''مس صاحبہ کی گائے کیلئے قیدیوں کے بھتے سے روٹیاں خشک کر کے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں پھر بوری بھر کر لے جائی جاتی ہے۔'' اس پر مجھے یاد آیا کہ آپا برکت سارا

دان روٹیاں خشک کرتی ہے۔ ہم نے اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ روٹی کے ٹکڑے کیوں سکھائے جاتے ہیں۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ انہیں ہسپتال کے راشن سے چاول ملتے ہیں اس لئے روٹیاں بچ جاتی ہیں۔ اور وہ انہیں سکھاتی ہیں۔ مگر اب سمجھ میں آیا کہ مس بھی وہی ''دھندہ'' کرتی ہے مگر ذرا مختلف طریقے سے۔ چونکہ میٹرنس بھی مزدوروں کے طبقے سے ہیں اس لئے قیدیوں سے چھینی ہوئی روٹیاں وہ خود کھا جاتی ہیں مگر مس ایک افسر ہے اس لئے روٹیاں اس کی گائے کے کھانے کے لائق ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مس، اماں مہلاں کو علی خان کی دو روٹیوں کے بدلے ہر مہینے صابن کی دو ٹکیاں دیتی ہے۔ وہ بچوں کے لئے ہر ہفتے سرکاری طور پر ملنے والا آدھا صابن خود رکھ لیتی ہے اور پھر میٹرنس سے روٹیاں لے کر صابن انہیں دے دیتی ہے۔ بیچارے بچوں کی مائیں اپنے آپ کو اور بچوں کو بھوکا رکھ کر روٹیاں بیچتی ہیں کیونکہ بچے چھوٹے ہیں اور کپڑے جلد خراب کر لیتے ہیں اس لئے صابن کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے اپنی روٹیوں میں سے علی خان کو ایک روٹی دی اور پتہ نہیں کتنی دیر تک ان ہیرا پھیریوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۴-۸-۷۰

تھوڑی دیر پہلے گھر خط لکھ رہی تھی کہ خانزادی نے آ کر پوچھا ''کیا لکھ رہی ہو؟۔'' میں نے جواب دیا ''گھر خط لکھ رہی ہوں۔'' وہ بولی ''بہن! مجھے بھی خط لکھ کر دو گی؟۔'' میں نے کہا ''کیوں نہیں؟۔'' کہنے لگی ''تم نہیں لکھ کر دو گی۔'' میں نے کہا ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟۔'' بولی ''مجھے ایک خط چھپ کر لکھوانا ہے!۔'' میں نے کہا ''کہاں؟۔'' کہنے لگی ''اسی کو جو مجھے یہاں لایا اور تم سے ملاقات کروائی۔'' میں سمجھ گئی۔ میں نے کہا ''اس نے تمہیں یہ دن بھی دکھائے اور پھنسا بھی دیا، پھر بھی تم اسے خط لکھوا رہی ہو؟۔'' بولی ''بہن کیا کروں اس کی یاد ہی بہت آتی ہے!۔'' میں نے پوچھا ''آخر خط چھپ کر کیوں لکھوں؟۔'' وہ بولی ''مس کہتی ہے صرف عزیزوں کو خط لکھو کسی اور کو نہیں! مس کو کیسے سمجھائیں کہ جن کی خاطر ہم نے سب کچھ لٹا دیا! ان سے بڑھ کر عزیز کون ہو سکتے ہیں!۔''

خانزادی ہمارے ساتھ کھاتی پیتی ہے۔ چوبیس پچیس سال کی عمر ہوگی۔ اس کا بارہ سال کا ایک بچہ ہے۔ پیر گوٹھ کی رہنے والی ہے۔ اس کی شادی ایک مولوی سے کروادی گئی تھی۔ عبدالقادر گاؤں کا چھوٹا زمیندار (وڈیرہ) ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کی راہ چلتے خانی کے ساتھ ملاقات ہوگئی۔ پھر یہ ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک دن خانی کا شوہر اچانک مر گیا۔ ڈاکٹر نے کہا اسے زہر دیا گیا ہے۔ پولیس نے خانی اور عبدالقادر کو گرفتار کر لیا۔ جرگے میں کیس چلا۔ عبدالقادر پیسے والے کا بیٹا

تھا چنانچہ اس کے باپ نے اس کا کیس جرگے سے نکلوا کر عدالت میں داخل کروا دیا۔ جہاں سے عبدالقادر رہا ہو گیا۔ خانی دو سال تک کچی قیدی رہی۔ پھر جرگے نے دس سال کی سزا سنا دی۔ خانی کا بیٹا حسن بھی ماں سے ناراض ہے اور کہتا ہے کہ میرے باپ کو مارا گیا ہے اسی لئے وہ ماں سے ملاقات کے لئے بھی نہیں آتا۔ خانی اسے بہت یاد کرتی ہے۔ اس دن وہ روتے ہوئے گنگنا رہی تھی:

کالے کا رنگ ہرا ہے
حسن لاری میں آیا ہے
پیر گوٹھ والی میں آیا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر
۲۵-۸-۷۰

آج ہمارے امتحانات کا ٹائم ٹیبل آ گیا ہے۔ امتحان یکم ستمبر سے ہوں گے۔ ہم جیل میں امتحان دیں گے۔ یہاں سے اسی لڑکے معافی مانگ کر رہا ہو گئے ہیں۔ باقی گیارہ لوگ ہیں جن میں سے دو امتحان دیں گے۔ آج میں سارا دن پڑھتی رہی۔ دو کتابیں کم ہیں اس لئے ایک لائبریری سے منگوائی ہے۔ امتحان کی وجہ سے مس نے کام سے چھٹی دے دی ہے۔

آج اماں غلام فاطمہ کا سو روپیہ اور دو گج (کاڑھے ہوئے گلے) چوری ہو گئے۔ جیل میں پیسے رکھنا قانوناً جرم ہے۔ اماں فاطمہ نے پانچ سال تک راشن میں ملنے والی چائے کی پتی اور دوسرا سامان بیچ کر سو روپیہ اکٹھا کیا تھا۔ یہ پیسے اس نے پلنگ کی نوار میں رکھے ہوئے تھے۔ رات کو کسی نے نکال لئے۔ بیچاری دیر تک روتی رہی۔ مس سے بھی کہا۔ جس نے جواب دیا ''میں قانونی طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ اس معاملے کو میٹرنس اور قیدیوں کے ایمان پر چھوڑتی ہوں اگر وہ دے دیں تو کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' آج اماں فاطمہ نے سب عورتوں سے قرآن پر ہاتھ رکھوایا۔ سب عورتوں نے ہاتھ رکھا مگر اماں بی بی جان (میٹرن) کشور اور اس کی سوتن آپا برکت نے نہ رکھا۔ امان بی بی جان کہہ رہی تھی ''مس میرا کیا کر لے گی۔ قصوروار تو وہ خود (غلام فاطمہ) ہے۔ ابھی جا کر صاحب سے کہہ دوں گی کہ عورتوں کے پاس پیسے کہاں سے آئے؟''۔ دوسری عورتوں کا کہنا تھا کہ پیسے بی بی جان اور کشور نے نکالے ہیں کیونکہ اماں غلام فاطمہ کی اور اس کی آپس میں نہیں بنتی۔ ان کا دو تین بار جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ پیسے تو خدا جانے کس نے اٹھائے مگر مجھے اماں فاطمہ پر بہت ترس آ رہا تھا۔ کل سے بیچاری کھانا بھی نہیں کھا رہی تھی۔ آج سارا دن دھوپ میں بیٹھی سر پر قرآن رکھے بددعائیں دے رہی تھی۔ اس نے پانچ سال بیماری میں اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ پیسے جمع کئے تھے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۷۰-۸-۲۶

رات کے نو بجے

علیمہ کی بہن مرگئی۔ آج اس کے ماں باپ اس کی ملاقات کے لئے آئے اور اسے بہن کے مرنے کی اطلاع دی۔ وہ تھیں ہی دو بہنیں جن میں سے ایک مرگئی اور دوسری جیل میں ہے۔ علیمہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی اور دوسروں کو بھی رلا رہی تھی۔ وہ رو رو کر چیخ رہی تھی ''اور میری مومل بہن! او میری کونج بہن! مجھے تنہا چھوڑ گئی ہو۔ میری پیاری! مجھے ان کالے کوٹوں میں کس کے سہارے چھوڑ گئی ہو۔ ہائے اب کون اس بے کس سے ملنے آئے گا۔ ہائے میں کسے بہن کہہ کر بانہوں میں لوں گی۔ میں اماں ابا کو تمہارے آسرے چھوڑ آئی تھی۔ میری بہنا! اب تو میں یہاں ایک دن بھی نہ گذار سکوں۔'' وہ سارا دن بڑبڑاتی رہی۔ ''میری پیاری بہن، میری کونج بہن، او میری کنواری بہن'' حلیمہ پندرہ یا سولہ سال کی دبلی پتلی، چھوٹی سی سانولے رنگ کی لڑکی ہے۔ شوہر کے قتل کے مقدمے میں دس سال کی سزا کاٹ رہی ہے۔ اس کا شوہر اسی سال کا بوڑھا تھا۔ ایک دن اس نے اور اس کے ایک عزیز نے اسے کلہاڑیوں سے مار کر گھر میں دفنا دیا۔ میرے پوچھنے پر بتانے لگی ''جس کمرے میں میرے شوہر کی لاش دفن تھی میں اس کمرے میں قدم بھی نہیں رکھتی تھی۔ مجھے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اپنی بہن (جو اب مرگئی ہے) کے پوچھنے پر سچ بتادیا۔ پولیس نے مجھے اور میرے اس عزیز کو گرفتار کرلیا۔ وہ بھی سزا کاٹ رہا ہے۔ حلیمہ، بہن پٹھانی (مقدم) کی اردلی ہے۔ وہ اس کا کھانا پکانے اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام کرتی ہے۔ سارا دن گنگناتی رہتی ہے

میرا دل ہے درد کا مارا
درد نہ جانے کوئی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۸-۸-۷۰

رات دس بجے

کل میں نے ڈائری نہیں لکھی۔ سارا دن پڑھتی رہی۔ شام کو سر درد ہو گیا۔ اے پی سی کی دو پڑیاں کھائیں، تھوڑا سا افاقہ ہوا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد دماغ پھر بوجھل ہو گیا۔ نسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ کچھ دیر سونے کے بعد آرام آیا ہے۔ رات میں نے سوچا کہ آج پڑھائی نہ کروں۔ جیل کا کام معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ دو تین نئی قیدی عورتیں آئی ہیں۔ جبکہ ایک قیدی عورت ضمانت پر رہا ہو گئی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ اور مجھ سے مکرانی زبان میں بات کرتی تھی۔ وہ ایک میٹرن اور ایک قیدی عورت کے علاوہ کسی اور سے بات نہیں کرتی تھی۔ جب ہم یہاں آئی تھیں اور مس سے بات کر رہی تھیں تو اس نے ہم سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا تھا ''یہ ہمارا ماں باپ ہے، اس سے ایسے نہیں بولو۔'' اسی دن سے یہ عورت مجھے بہت بھانے لگی تھی۔ سب اسے زیبو کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی تھی کہ دراصل میں ایران کی رہنے والی ہوں۔ وہاں سے ایک پٹھان مجھے بہکا کر لے آیا اور ایک نواب کے ہاتھوں بیچ دیا۔ اس نواب سے میرا ایک بیٹا بھی ہے جو جیکب آباد میں باپ کے پاس رہتا ہے۔ میری قسمت پھوٹی۔ اپنے مقدروں پر لات مار کر میں نواب کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ کر سکھر آ گئی۔ سکھر آ کر میں نے دائیوں والا کام شروع کر دیا۔ دو مرتبہ پہلے بھی گرفتار ہوئی تو میرے ڈرائیور شوہر نے مجھے ضمانت پر رہا کروالیا۔ مگر پھر ایک مصیبت میں پھنس گئی۔ میں نے پوچھا ''اس بار کیسے آئی؟۔'' تو وہ بتانے لگی: ''کسی عورت کا حمل گرانے کے جرم میں یہاں آئی ہوں۔''

زیبو کے نصیب! کتنی آسائشوں کو چھوڑ کر کہاں آ کر خوار ہوئی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ''ایک سورج دو پرچھائیاں۔'' کسی زمانے میں بہت نرم و نازک ہوتی تھی مگر

اب تو نشے نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ پھر بھی مسجد تو گر جاتی ہے لیکن اس کے مینار اس کی شان وشوکت کی گواہی دیتے ہیں۔ چرس پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ جب بھی تاریخ پر جاتی اس کا ڈرائیور شوہر اسے نسوار اور چرس لا دیتا تھا۔ وہ ختم ہونے کے بعد وہ سارا دن میٹرنس کی منت سماجت کرتی۔ ایک بار تو اس نے سپرٹ پی لی۔ جس پر مس، مقدم اور میٹرن نے اس پر نشدد بھی کیا اور کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ کبھی کشور کی منتیں کر کے نیند کی گولیاں لے لیتی۔ یہاں اسے کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر اس کی کوئی دوست تھی تو وہ بی بی تھی۔ جب زیبو کا شاہانہ دور تھا تب بی بی اور زیبو کی آپس میں خوب دوستی رہی تھی۔ بی بی کوئٹہ کی پٹھانی ہے۔ بہت موٹی ہے اور اس کا چہرہ جلا ہوا ہے جو بہت بھیانک لگتا ہے۔ یہاں اگر مجھے کوئی سچ مچ کی مجرم لگتی ہے تو وہ بی بی ہے۔ بی بی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بردہ فروش عورت ہو۔ بی بی کو دو تین مقدمات میں اکٹھی تئیس سال کی سزا ہے۔ بلڈ پریشر کی مریضہ ہے، اس لئے ہسپتال میں داخل ہے۔ اسے جو چائے کی پتی اور چینی وغیرہ ملتی ہے، اس سے وہ سارا دن چائے کی کیتلی چڑھا کر بیٹھی رہتی ہے۔ چائے کی لالچ میں کئی میٹرنس کی اس کے پاس بھیڑ لگی رہتی ہے۔ گپیں شپیں لگاتی ہیں۔ میٹرنس چائے کے بدلے اس کو کبھی پیاز کبھی لہسن لا کر دے دیتی ہیں۔ ایک وقت تھا جب بی بی سارا دن زیبو کے ساتھ شیر وشکر رہتی تھی۔ اور اس وقت بیچاری زیبو چائے کے ایک گھونٹ یا چٹکی بھر نسوار کے لالچ میں سارا دن بیبی کی حاضری میں بیٹھی رہتی تھی۔ بی بی گالیاں بھی بہت دیتی تھی۔ پھر بھی زیبو ہنس کر چپ چاپ سنتی رہتی۔ آج جاتے وقت وہ بی بی سے گلے مل کر رونے لگی۔ بی بی جو ہمیشہ زیبو کو گالیاں دیتی تھی۔ آج وہ بھی رو پڑی۔ زیبو کی میرے ساتھ بہت گپ شپ رہتی تھی۔ آج مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری زندگی میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۰-۹-۷۰

آج کم وبیش بیس اکیس دنوں کے بعد ڈائری لکھ رہی ہوں۔ یہ سارے دن کس طرح گزرے اس کا مجھے کوئی ہوش نہیں۔ گذشتہ ماہ کی اٹھائیس تاریخ کو میرے سر میں درد ہوا تھا۔ پہلے دو دن تو بہت درد ہوتا رہا لیکن پھر دماغ کی نسیں سکڑنے لگیں۔ میں سمجھی شاید پڑھنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اسی لئے ایک دن آرام کیا مگر تیس تاریخ کو سر درد بڑھ گیا۔ نسوں کا کھنچاؤ بھی زیادہ ہوگیا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا تو اس نے کارمینٹو مکسچر اور ای پی سی کی پڑیاں لکھ کر دیں۔ ساتھ ہی ناک کو بھاپ دینے کیلئے کہا۔ یہ علاج بھی کیا مگر حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ پھر ایک دوسرا چکر شروع ہوا۔ یعنی آدھے سر کا درد اور سر کا ٹھنڈا پڑ جانا۔ سر ایسے ٹھنڈا ہوجاتا تھا جیسے برف۔ دو دو کمبل اوڑھ کر سوتی تھی۔ آخر درد برداشت سے باہر ہوگیا اور وہ مجھے نشے کے انجکشن لگانے لگے اس لئے میں چوبیس گھنٹے بیہوش رہتی۔ ہوش میں آنے پر وہی حالت ہو جاتی۔ پانچ چھ ٹیکوں کے بعد ڈاکٹر کہنے لگا کہ انجکشن کا لگنا خطرناک ہے اس پر وہ مجھے نشے کی چار گولیاں دیتے تھے جن کا اثر بھی کم وبیش ویسا ہی تھا۔ بیماری کا علاج صرف نشے کے انجکشن ہی تھے۔ اور میں بہت پریشان ہوگئی۔ دس گیارہ دن گذر گئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ گھر سے دو تین خط آئے۔ جب نشہ کم ہوتا تو نسیم پڑھ کر سناتی تھی۔ ہمیں گھر والوں کو بیماری کے بارے میں لکھنے سے روک دیا گیا اس لئے نسیم نے صرف خیر

وعافیت لکھ کر بھیج دی۔ آخر کسی ترکیب سے گھر والوں کو بھی اپنی بیماری کی اطلاع بھیج دی۔

خط بھیجنے کے کچھ دن بعد باہر ہسپتال سے میرا نیا چارٹ بن کر آیا جس میں میری نبض کی رفتار، خون کا دورانیہ اور کتنی ہی دواؤں کے نام لکھے ہوئے تھے کہ یہ مریض کو دئے جاتے ہیں حالانکہ میں نے ان دواؤں کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے کبھی میرا بلڈ پریشر چیک نہیں کیا تھا۔ نہ ہی چارٹ کے مطابق کبھی خوراک ملی۔ تھوڑی دیر کے بعد مس آئی اور مجھے کہنے لگی ''اختر تم سارا دن لیٹی رہتی ہو۔ اٹھ کر گھومو پھرو، دوڑ لگاؤ!! نسیم سے کوئی کھیل کھیلو! اس طرح ٹھیک ہو جاؤ گی۔ مس کا مجھے یوں کہنا بڑا عجیب لگا کہ آج اچانک اسے میری فکر کیوں لگ گئی ہے۔ بہر حال میں نے اس سے کہا: ''اٹھتی ہوں تو سر چکراتا ہے۔ اور درد بڑھ جاتا ہے۔'' مس چلی گئی مگر تھوڑی دیر کے بعد نسیم آئی کہ مس بلا رہی ہے۔ اس وقت میرے سر میں درد بھی شدید تھا، مگر میں مس کے بلانے پر چلی گئی، وہ بولی ''اختر تم میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرو، سو جاؤ گی تو زیادہ درد ہوگا!۔'' میں بڑی حیران ہوئی کہ آخر مس آج مجھے اپنے پاس کیوں بٹھا رہی ہے اور اتنا قرب کیوں جتا رہی ہے؟ اچانک دروازہ کھلا۔ میں اٹھ کر جانے لگی تو مس نے کہا ''تم یہیں بیٹھی رہو!۔'' میں بیٹھ گئی۔ میٹرن چلائی ''میڈیکل صاحب!۔'' مس یہ سن کر کھڑی ہوگئی اور وہاں سے واپس آ کر ہسپتال میں لیٹ گئی۔ اچانک کشور بھی دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی ''نہ جانے میڈیکل افسر کے ساتھ دوسرا کون ہے۔ اس اثناء میں میڈیکل افسر، دو ڈاکٹر، سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی

سپرنٹنڈنٹ اور ایک دوسرا آدمی اندر آ گئے۔ ڈاکٹر ان لوگوں کو تمام مریضوں کے متعلق بتانے اور چارٹ دکھانے لگا۔ اس آدمی نے پوچھا ''بھوک ہڑتال کے سلسلے میں جو طالبات آئی ہیں وہ کہاں ہیں؟۔'' ڈاکٹر نے اس کو میرے حوالے سے بتایا کہ ہسپتال میں داخل ہے۔ اس آدمی نے میرا چارٹ دیکھا۔ میرا بلڈ پریشر چیک کیا، آنکھوں کا معائنہ کیا۔ وہ سندھی میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ میرا خون وغیرہ ٹیسٹ کرنے کی ہدایت دے کر چلا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سکھر کا سول سرجن تھا۔ اچانک چیک اپ کرنے آیا تھا۔ تب مجھے سمجھ آئی کہ مس مجھے زبردستی اپنے پاس کیوں بٹھا رہی تھی اور اتنی مہرباں کیوں ہو رہی تھی۔ میرا نیا (جھوٹا) کارڈ کیوں بن کے آیا تھا۔ جیل حکام نے نشے کے ٹیکوں کے علاوہ میرا کوئی علاج نہیں کیا تھا۔ اب جب معائنے کا وقت آیا تو وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ لڑکی بالکل ٹھیک ہے۔ تین دنوں سے کیپسول، ایک سیرپ اور گولیاں دینا شروع کی ہیں، ان سے کچھ فائدہ ہوا ہے۔ اب بھی کبھی کبھی درد بڑھ جاتا ہے اور کبھی کم ہوتا ہے۔ ہسپتال کا راشن بھی لگ گیا ہے۔ بیماری کے ان دنوں میں نسیم نے میری اتنی خدمت کی ہے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ایسی حالت میں تو سگی بہن تک تنگ آ جاتی ہے۔ درد سے ہار کر میں نے دو تین بار اسے جھڑکیاں بھی دی ہیں لیکن وہ کبھی ناراض نہیں ہوئی۔ آدھی آدھی رات تک بیٹھی رہتی تھی۔ ویسے بھی جیل کی سندھی قیدی عورتوں نے کافی حد تک مجھے سنبھالا ہے۔ باری باری مجھے دباتیں اور تسلیاں دیتیں جیسے میں ان کا اپنا خون ہوں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۱-۹-۷۰

تھوڑی دیر پہلے گھر سے آیا ہوا خط پڑھا۔ بیماری کے دنوں میں گھر سے جو بھی خط آئے تھے وہ میں نے نہیں پڑھے تھے جب بھی تھوڑی سی ہوش میں آتی تو نسیم پڑھ کر سنا دیتی تھی۔ ایک خط چھوٹے ایاز کا لکھا ہوا ہے، خط کیا ہے بس الٹی سیدھی لکیریں ہیں۔ جس کا مطلب اماں نے یہ لکھ کر بھیجا ہے کہ ''میرے لئے گلہری پکڑ لانا ورنہ تمہیں گھر نہیں آنے دوں گا۔ اگر گلہری نہ پکڑ سکو تو کوئی چوہا وغیرہ لیتی آنا۔'' ایاز کی الٹی سیدھی لکیریں بھی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ خط بھی کتنی پیاری چیز ہے، اس کا کس قدر انتظار ہوتا ہے۔ ہمارے خط تو پھر بھی جلدی آ جاتے ہیں لیکن جن عورتوں کے خط کافی دیر کے بعد آتے ہیں ان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے وارڈ میں جب باہر سے ڈاک آتی ہے تو تمام عورتیں کام کاج چھوڑ کر، بھاگتی ہوئی میٹرن کے چاروں طرف اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ ان میں پڑھی لکھی ایک بھی نہیں ہے اس لئے وہ میرے یا نسیم کے پاس آتی ہیں۔ دور سے ہی بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ ''اختر! اختر! نسیم! نسیم! خط!۔'' ہم لفظ ''خط'' سن کر ہی سمجھ جاتی ہیں کہ شاید ہمارا خط آیا ہے۔ ہم سی کلاس کی طرف دوڑتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا دل بھی دھک دھک کرنے لگتا ہے کہ کس کا خط ہے؟ کیا لکھا ہے؟ کبھی کبھی ان خطوں میں سچ مچ ہمارا خط بھی ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار نہیں بھی ہوتا۔ جن کے خط آئے ہوتے ہیں ان کے تو ہاتھ پاؤں ہی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ بعض تو خط کھولنے سے پہلے ہی رو پڑتی ہیں۔ وہ خاموش

ہوں تو ہم خط پڑھیں۔ پھر کہتی ہیں ''خدا کرے خط میں سب خیریت ہو۔'' کسی کا خیریت کا خط ہوتا ہے تو کسی کے خط میں صرف اتنا لکھا ہوتا ہے کہ فلاں دن، فلاں تاریخ کو ملاقات آئے گی۔ اتنا سنتے ہی وہ خوشی سے ناچنے لگتی ہیں۔ اس دن وہ بیچاریاں کھانا کھانا بھی بھول جاتی ہیں۔ کئی عورتوں نے خط کیلئے بی بی سعیدہ کی کہانی کی منت مانی ہوتی ہے اور کسی نے بادشاہ پیر کی کوئی منت مانی ہوتی ہے۔ جن کی منت پوری ہو جاتی ہے وہ مجھے اور نسیم کو پکڑ کر کہتی ہیں ''چلو بی بی سعیدہ کی کہانی سناؤ!'' کہانی سن کر سب قیدیوں میں گڑ یا چینی تقسیم کرتی ہیں۔ ایک خط میں اماں نے لکھا ہے:

پیاری بیٹی اختر اور نسیم!

حیدرآباد سندھ

موسم اتنا اچھا ہے کہ کیا کہنا۔ آج کے دن جو گھر بیٹھے وہ کافر ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ساتھی دور ہیں۔ ساری رات بوندیں پڑتی رہیں۔ شیخ ایاز کا شعر یاد آ گیا۔

بادل رے بادل! نینوں کی جھڑی رکنے کا نام نہیں لیتی۔

تمہاری ماں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۳-۹-۷۰

رات کے آٹھ بجے

ہمارے سامنے والی کوٹھڑی میں قائماں، اماں بی بی جان (میٹرن) سے گپ شپ کر رہی ہے۔ قائماں کو کل آدھی رات کے وقت لایا گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی سی کلاس والی عورتوں سے سنا کہ ''رات ایک لڑکی آئی ہے لڑکی کیا ہے، بس چاند کا ٹکڑا ہے!۔'' یہ بات سن کر میں اور نسیم اچھل پڑیں اور تیزی سے بستر سمیٹ کر سی کلاس کی طرف بھاگ پڑیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ چارپائی پر اماں چھوٹی (میٹرن) کے قریب ایک لڑکی چادر سے منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ صرف اس کی دو خوبصورت بھوری آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ عمر تقریباً سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ سی کلاس کی ساری قیدی عورتیں چارپائی کے چاروں طرف اکٹھی ہوگئی ہیں۔ بہن پٹھانی (مقدم) اپنا ہمیشہ والا صاف ستھرا لباس پہنے کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے اور کسی نئی قیدی پر رعب ڈالنے کیلئے ہمیشہ کی طرح اونچی آواز میں کہہ رہی ہے ''اری! جلدی جلدی صفائی کرلو!۔'' اری رتنی! کیا چائے ابھی تک نہیں بنی؟۔ بی بی آٹھ بج رہے ہیں یہ خانی بھی کسی مستی میں ہے! دس بجے چائے بانٹتی ہے۔'' ہم بھی جا کر بہن پٹھانی کے قریب کھڑی ہوگئیں۔ لڑکی ہماری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اتنی احتیاط سے دبک کر بیٹھی ہوئی تھی کہ کیا کہیں۔ عورتیں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کئے ہوئے تھیں۔ لیکن لڑکی تو یوں تھی جیسے دیوار۔ بس چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اماں چھوٹی طعنوں کے تیر برسا رہی

تھیں ''کیا کر کے آئی ہے؟ اب یہاں بیٹھ کر مٹکے بھر اور جیل کی دال روٹی کھا!۔۔۔ لڑکی تجھے اپنی خوبصورتی اور جوانی کا بھی خیال نہ آیا! تو بھی خیر سے عشق کرنے چلی تھی۔۔۔ بی بی! تمہیں شرم نہ آئی، چھوٹی سی معصوم بیٹی چھوڑ کر آئی ہو!''۔۔۔ ''ارے اب یہ گھونگھٹ اتار دو!۔'' لڑکی چہرے سے دوپٹہ اتار کر بیٹھ گئی اس کا حسن واقعی قابل تعریف تھا۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اماں چھوٹی کی یہ باتیں سن کر مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو وہاں پڑا ہوا مٹکا اس کے سر میں دے مارتی۔ ایک تو بیچاری لڑکی کا اپنا دکھ، اوپر سے ان کے طعنے اور سوال۔ اماں چھوٹی خود کون سی نیک پاک ہے جو اس پر نکتہ چینی کر رہی ہے۔

اس اثناء میں سبھائی (ایک قیدن) نے لڑکی سے چلا کر کہا ''اب بہت ہو چکا لڑکی، اٹھو اور پانی کا مٹکا بھر دو تا کہ باقی حصے کی بھی لپائی کر لیں۔'' بیچاری لڑکی بھاگ کر اٹھی اور مٹکا اٹھا کر حوض سے پانی بھرنے لگی۔ میں دل میں سوچنے لگی کہ اگر اس سے آج کا کام نہ لیا جاتا تو کیا جیل کی لپائی رہ جاتی؟۔ وہ باہر کی آزاد دنیا سے اس قید خانے میں آئی ہے۔ پہلے ہی بہت ڈری ہوئی ہے۔ سب کو چاہئے تھا کہ آج اسے حوصلہ دیتیں۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتیں تا کہ اس کا خوف کم ہو جاتا اور وہ خود کو یہاں رہنے کیلئے تیار کر لیتی لیکن یہاں آتے ہی سب نے اسے سب سے خوفزدہ کر دیا ہے۔ ایک طرف میٹرنس اور دوسری طرف یہ قیدی عورتیں! یوں لگتا ہے جیسے اس بیچاری نے ان کا کوئی قصور کیا ہو۔

میں نے یہاں اکثر دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی نئی قیدی یہاں آتی ہے تو باقی قیدی عورتیں اپنے پرانے ہونے کا رعب جماتی ہیں اور نئی قیدی سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتی ہیں جب یہ خود نئی آئی ہوں گی تو ان سب کے ساتھ بھی یقیناً یہی سلوک ہوا ہوگا (یہ روایت ایک طویل عرصے سے جاری ہے) اس لئے پرانی قیدی عورتیں، نئی آنے والیوں کو طعنوں اور ملامتوں سے مار دیتی ہیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد چائے پینے کا بلاوا آیا۔ سب عورتیں چائے لینے گئیں تو ہم بھی چلی گئیں۔ چائے پی کر واپس آئیں تو وہ لڑکی ابھی تک دوپٹے میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''چائے پی ہے؟۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے دل میں سوچا کسی نے اسے چائے لا کر بھی نہیں دی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گئی، چائے پلائی، ناشتہ کروایا۔ پھر پوچھا ''نام کیا ہے تمہارا؟' بولی ''قائماں۔'' قائماں بھی اپنے شوہر کے قتل میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے۔ ذات کی پھلپوٹی ہے۔ کہنے لگی ''میرا کوئی قصور نہیں ہے اور نہ ہی میں شوہر کے قتل میں شریک تھی۔'' اس کی شیر خوار بچی کا نام اسلام ہے۔ بیٹی کا نام لیتے ہی وہ زور زور سے رونے لگی۔ پھر مس آئی اور قائماں کو جھڑکیاں دینے لگی ''شرم نہیں آتی رات بھی تمہارے برقعے کے بٹن کھلے تھے! اور اب بھی سر پر دوپٹہ نہیں ہے! یہاں چال چلن ٹھیک رکھنا پڑے گا ورنہ مار مار کر چمڑی ادھیڑ دوں گی۔''

سینٹرل جیل، سکھر

۲۴-۹-۷۰

آج ہمارے پاس سی کلاس کے دو تین مریض آئے ہوئے ہیں۔ ایک مریم، دوسرے مسٹر علی خان صاحب اور تیسری تاج محل۔ میری اور کشور کی چارپائی ان مریضوں کو دے دی گئی ہے اس لئے ہم نے اپنے بستر زمین پر بچھا لئے۔ علی خان کو بہت تیز بخار ہے۔ آج شام اس کی ماں اسے ہسپتال لائی۔ نرس کشور تو مس کے بچوں کی خدمت میں رہتی ہے۔ اس لئے چاہے کوئی جیئے یا مرے اس کی بلا سے۔ حرام ہے جو وہ کسی کو بخار کا مکسچر تک دے دے۔ ہسپتال میں دوسری کام والی بہن زرینہ بھی سارا دن مس کے کپڑے دھونے میں لگی رہتی ہے لیکن جب ڈاکٹر آتا ہے تو دونوں چادریں اوڑھ کر قطار میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میں نے کشور سے تو تین بار کہا کہ لڑکے کو بہت تیز بخار ہے، تم چل کر اسے دوا دے دو یا ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کر دو۔'' وہ بولی ''پپو میاں سو جائے تو پھر آتی ہوں۔'' جب تک مس صاحبہ کا پپو سوئے تب تک وہ معصوم خواہ مر جائے! میں نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا تو ۱۰۵ ڈگری بخار تھا۔ اس کی ماں بیچاری روئی جا رہی تھی۔ آخر دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر آیا اور اس نے کہا ''میں برف بھیجتا ہوں اس پر ٹھنڈی پٹیاں رکھو۔'' برف تو نہ آئی اس لئے ٹھنڈے پانی سے اسپنج کیا۔ مریم کو بھی بہت تیز بخار ہے۔ علی خان تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چیخ مار کر اٹھ جاتا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۵-۸-۷۰

آج ہماری ملاقات آئی۔تقریباً ۱۲ بجے جیلر آیا اور اس نے مجھے اور نسیم سے کہا کہ ہم اپنے اپنے عزیزوں کے نام لکھ کر دے دیں۔ پہلے تو ہم سمجھیں کہ شاید ہم رہا کی جارہی ہیں کیونکہ یکم اکتوبر سے امتحان ہونے والے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد میٹرن چلائی ''اختر! ملاقات۔'' میں اور نسیم دوڑ کر دروازے پر گئیں۔ابھی ملاقات دور تھی۔صرف مس بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے کہا ''اختر! صرف تمہاری ملاقات ہے اور نسیم! تم اندر جاؤ!۔'' یہ بات سن کر ملاقات کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ میں نے مس سے کہا ''ملاقات کریں گی تو دونوں، ورنہ واپس بھیج دو، پہلے بھی ہم دونوں نے ملاقات کی تھی۔'' مس کہنے لگی ''میں کیا کرسکتی ہوں صاحب کا آرڈر ہے۔'' نسیم کی آنکھیں نم تھیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں بھی ملاقات نہ کروں، ابھی ادھر کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ چھوٹا ایاز 'زینا!'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ایاز کے پیچھے زرینہ (ماموں کی بیٹی) مکرانی میں 'اے زینی!'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔اس کے پیچھے اماں اور بھائی تھا۔میں گلے لگ کر ملی۔ میں نے بتایا کہ مجھ سے عزیزوں کے نام لکھوا لئے گئے ہیں اور نسیم کو ملاقات نہیں کرنے دی۔ بھائی نے بتایا ''ہم نے تمہاری بیماری کے سلسلے میں جیل میڈیکل افسر، سپرنٹنڈنٹ اور سول سرجن سکھر کو تار بھیجا تھا شاید اسی لئے تمہیں تنگ کررہے ہیں۔ پہلے آسانی سے ملاقات کرنے دیتے تھے جیسے پہلے ہم رشوت دیتے ہوں اور اب سختیاں کر کے اگر ملاقات نہ کرنے دیں تب بھی کوئی پروا

نہیں۔ ہم اور تم ان ملاقاتوں سے بلند ہیں۔'' اماں نے گھر کی خیر خبر سنائی۔ ایاز اور زرینہ خاموشی سے نسیم کو مل کر آ گئے۔ بہن پٹھانی نے ایاز کو گلہری پکڑ کر دی۔ ایاز کہتا تھا کہ میں یہ گلہری حیدر آباد لے جاؤں گا۔''

اس بار ملاقات کی اتنی خوشی نہ ہوئی کیونکہ نسیم کو ملاقات کرنے سے روک دیا گیا۔ اس اثناء میں، میں سی کلاس چھوڑ کر بی کلاس میں آئی تو سومر اور یوسف (یہ دونوں اپنی ماؤں کے ساتھ سزا بھگت رہے ہیں۔ عمر تقریباً سات سال ہوگی) موٹی قمیضیں پہن کر دیوار کے قریب کھڑے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سومر یوسف سے کہہ رہا تھا ''سومر! بہن اختر کے بھائی نے پتلوں پہنی ہوئی تھی۔'' جس پر یوسف نے سومر سے کہا ''ارے تمہیں پتا ہے اس نے موزے بھی پہنے ہوئی تھے۔'' ''یوسف! تمہیں پتہ ہے اماں جو بنیان بنا رہی ہے اس کے بارے میں وہ کہہ رہی تھی کہ اماں بی بی جان کو دوں گی اور تمہارے لئے نیا جوڑا بنواؤں گی۔'' یوسف بولا ''مگر بی بی جان پتلون تھوڑی پہنیں گی پہلے پیرواں (اس کی ماں کا نام، وہ اسے نام سے بلاتا ہے) نے بھی ایک قمیض کاڑھ کر دی تھی۔ بی بی میرے لئے شلوار قمیض لے کر آئی۔ سومر ہمارے بدلے مچ جیل میں ہے نا، وہاں چاچا ہماری ملاقات کے لئے آئے گا نا، میں اسے کہوں گا کہ وہ ایسی ہی پتلون لے کر آئے اور تمہیں پتہ ہے عید پر صاحب ہمیں کپڑے دے گا۔'' پھر سومر بولا ''یوسف، اختر بہن کے بھائی کو جھولے پر چڑھنا نہیں آتا۔ تم نے دیکھا؟ کیسے کر رہا تھا! اور میں تو آرام سے پیڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتا ہوں نا!''

یوسف اور سومر کی باتوں نے آج پھر میرے دل میں اپنے اس غلیظ نظام کے

خلاف نفرت بھر دی ہے۔ سوچتی ہوں کہ ان معصوم بچوں کا کیا قصور؟ یہ کیوں بیس بیس سال تک سزا کاٹتے ہیں؟۔ سومر اور یوسف، زیادہ عرصہ اس ماحول میں، ایک ہی چھوٹے سے وارڈ میں رہنے کی وجہ سے گھبرا سے گئے ہیں اور شرارتیں بھی بہت کرنے لگے ہیں۔ اس لئے ان پر ہر عورت کی گالیوں کی بوچھاڑ پڑتی ہے۔ بہانے بہانے سے کوئی نہ کوئی میٹرن روز ان بیچاروں کو مارتی اور ان کی ماؤں کی بے عزتی کرتی ہے۔ مس تو انہیں انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے! اس دن مس کی بیٹیاں سومر اور یوسف کو کھیلنے کیلئے ساتھ لے گئیں۔ مس کو جب پتا چلا تو اس نے اپنی بچیوں کو تو کچھ نہ کہا مگر ان بیچارے معصوم بچوں کو ڈنڈوں سے بری طرح مارا اور ان کی ماؤں کو بلا کر کہا ''اپنے حرامیوں کو روکو۔ اگر میں نے دوبارہ انہیں اپنی بیٹیوں کے ساتھ دیکھا تو تمہیں بھی سزا ملے گی۔'' وہ بیچاری کہہ رہی تھیں ''ہم کیا کریں؟ آپ کی لڑکیاں زبردستی بلا کر لے جاتی ہیں۔''

یہ بچے قیدی تو نہیں ہیں، ان کے لئے جیل سے باہر سکول ہونے چاہئیں جہاں وہ کم از کم آدھا دن آزاد دنیا میں میٹرنس اور مس کی دہشت اور دباؤ سے دور رہیں، جہاں کوئی بھی ان سے نفرت نہ کرے اور نا ہی انہیں ماؤں کے گناہوں کے طعنے دے، جہاں وہ اپنے ہم عمروں کی صحبت میں وقت گذاریں اور سمجھیں کہ ہم آزاد ہیں۔ یہ بچے جنہیں قسمت ایسے ماحول میں لے آئی ہے، وہ دس دس سال یہاں گذارنے کے بعد کون سے خیالات، کون سی عادتیں لے کر یہاں سے نکلیں گے؟

سر میں ابھی تک ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ روز رات کو نیند کی چار گولیاں کھاتی ہوں تب کہیں نیند آتی ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۶-۹-۷۰

رات کے تقریباً نو بجے

آج نسیم کی ملاقات آئی ہے۔ نسیم آج بہت کھلی ہوئی ہے ابھی تک بیٹھی خانزادی کے ساتھ ملاقات کے متعلق باتیں کر رہی ہے۔ صبح خانی سے پوچھ رہی تھی ''خانی رہا ہونے کے بعد تم شادی کرو گی؟۔'' خانی نے جواب دیا ''بہن جس کی خاطر بال بچے چھوڑے، عمر گنوادی میری شادی تو اسی کے ساتھ ہے اور کونسی شادی!۔'' نسیم نے پھر پوچھا ''کیا وہ تمہیں اب نہیں پوچھتا؟۔'' خانی کہنے لگی ''بہن وہ بیشک نہ پوچھے لیکن میں تو مرتے دم تک اس کی ہوں۔'' اس پر مجھے ایک بات یاد آئی ہے۔ آج مجھے دادلی (قیدی عورت) کہنے لگی ''میرے عزیز کے لئے دو حرف لکھ دو'' وہ بھی اس کیس میں اس کے ساتھ اسی جیل میں ہے۔ کہنے لگی ''میں نے سنا ہے کہ میرے دیور نے میرے رشتہ داروں سے کہا ہے کہ اگر وہ اس کے بھائی کے خون کے بدلے دادلی کا رشتہ اس سے کر دیں تو وہ اسے چھڑا لے گا۔ لیکن میں اسے یہ پیغام بھیج رہی ہوں کہ میں اس کی پیشکش قبول نہیں کروں گی اور رہا نہیں ہوں گی۔ تم بھی گاؤں خط لکھ کر اس بات کا حل ڈھونڈو۔'' میں نے کہا ''پگلی! تم آزاد ہو رہی ہو۔ ادھر لپائی کرتے کرتے ختم ہو جاؤ گی۔ اپنے چھوٹے بیٹے (سومر) کی بھی عمر برباد نہ کرو۔ سزا بہت لمبی ہے کون جیتا ہے کون مرتا ہے۔ اور اس میں حرج کیا ہے۔ دیور سے شادی کر لو۔'' وہ کہنے لگی ''واہ! واہ! میں یہاں سے نکل جاؤں اور وہ بیچارہ جو میری خاطر جیل میں پڑا ہے یہیں پڑا پڑا گل سڑ جائے؟ چار سال گذر گئے ہیں، چھ سال رہ گئے ہیں وہ بھی گزر جائیں گے۔ زندگی ہوئی تو رہا ہو جائیں گے۔ کیا روز روز شوہر کئے جاتے ہیں؟۔''

دادلی کی بات سن کر میں سوچنے لگی کہ ان عورتوں کو اتنی لمبی قید کاٹنا منظور ہے، قید کی تکلیفیں اور عذاب منظور ہیں، وہ کہتی ہیں خواہ موت آ جائے لیکن بے وفائی نہیں کریں گی۔ بیوفائی کو یہ خون کرنے سے بھی بڑا گناہ تصور کرتی ہیں۔ یہ عورتیں ایک شخص کے ساتھ اتنی وفادار ہیں اور اگر ہم سب سندھی وطن پرست اپنی قوم کے ساتھ ان کے ایک حصے جتنے بھی وفادار ہو جائیں تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۸-۹-۷۰

رات ۱۱ بجے

ابھی ابھی نسیم کی آنکھ لگی ہے۔ اسے دو دن سے بہت بخار ہے۔ آج ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یکم اکتوبر سے امتحان ہو رہے ہیں اگر امتحان دینا چاہو تو تمہیں حیدرآباد بھیج دیں، میں نے ہاں کر دی ہے۔۔۔

سینٹرل جیل، حیدرآباد

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۱-۱۰-۷۰

رات ۹ بجے

آج حیدرآباد آئے ہوئے تیسرا روز ہے۔ ۲۸ تاریخ کی رات کو نسیم کو دابنے کے بعد، ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک کان میں ''اختر اختر!'' کی آواز پڑی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مس اور میٹرن نے دروازہ کھولا اور بولیں ''جلدی کرو، تمہیں حیدرآباد جانا ہے۔'' جلدی سے میں نے بیگ اٹھایا، اجرک اوڑھی۔ نسیم اس وقت قے کر رہی تھی، میں بہت پریشان ہوگئی، مگر جانا ہی پڑا۔ باہر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ مجھے روہڑی اسٹیشن لایا گیا۔ اس رات مجھے گردن میں درد محسوس ہوا مگر جس بیہودہ طریقے سے مجھے مردوں کے درمیان تھرڈ کلاس میں سفر کروایا گیا اس سے مجھے کم از کم نمونیا تو ہوگیا۔ گاڑی میں جگہ بنائی گئی اور انسپیکٹر میرے ساتھ آ بیٹھا۔ میں نے بیگ درمیان میں رکھ دیا۔ اس طرح میٹرن کے بغیر لانے پر مجھے اتنا غصہ آیا کہ سوچا ادھر بیٹھوں ہی نہ، لیکن پھر خیال آیا ''زینا! پروا نہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہے۔ سندھ کے مظلوم عوام نہ جانے کیا کیا برداشت کر رہے ہیں اور تم اتنی سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی؟ ہمارے ساتھ اس حکومتی رویے نے ہمارے دلوں میں اور بھی نفرت بھر دی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ سختیاں سہنے کیلئے تیار کر رہے

ہیں۔"

صبح تقریباً پانچ بجے حیدرآباد پہنچے حیدرآباد اسٹیشن سے کم وبیش آدھے میل کے فاصلے پر وہ مجھے چاوڑی تھانے میں لے کر آئے۔ میرے پاس بیگ تھا اس لئے چلنے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ تھانے سے پولیس کی گاڑی میں جیل لے کر آئے۔ جیل پہنچتے ہی مجھے سینے کا درد اور بخار ہو گیا۔ گلا بالکل بند ہو گیا۔ ایک تو گاڑی میں سردی لگی تھی پھر اسٹیشن سے تھانے تک آتے وقت بھی لگی، جس نے مجھے بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ ڈاکٹر کو اطلاع دی گئی تو اس نے انجکشن لگایا۔ آج صبح انگلش کا پیپر تھا مگر میں امتحان دینے کے قابل نہ تھی۔ آج گھر سے بھائی کا خط آیا ہے۔ بھائی نے لکھا ہے:

پیاری زینا!

تمہارا خط ملا، احوال پڑھ کر سخت غصہ آیا۔ تمہیں امتحان دینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تم اس بیماری کی حالت میں کیا امتحان دے سکو گی؟ لکھ کر دے دو کہ میں سخت بیمار ہوں۔ جس طرح مجھے سفر کروایا گیا ہے اس نے مجھے مزید بیمار کر دیا ہے۔ ہرگز امتحان نہ دو خواہ تمہیں واپس بھیج دیں۔۔۔ تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ تمہارے سخت بیماری کی حالت میں بھی جیل میں رہنے اور معافی لکھ کر نہ دینے کے عمل نے ہماری قوم کے حوصلے بلند رکھنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ جھوٹے اور بھات کھاؤ (جھوٹے مجنو) کون ہیں اور بہادر سرفروش کون ہیں، ان کا فرق ان باتوں سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔۔ تم ہمیں پل پل، گھڑی گھڑی یاد ہو مگر ہمیں خوشی ہے کہ تم میدان میں ہو۔

رسول بخش

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۲-۱۰-۷۰

طبیعت ابھی تک بہت خراب ہے۔ آج بھی انجیکشن لگا۔ یہاں میرا دل بالکل نہیں لگ رہا۔ بہت الجھ گئی ہوں' امتحان دینے آئی تھی، وہ بھی نہ دے سکی۔ دوسرے میں پکی جیل میں رہی ہوں جو ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرح آباد تھی۔ یہاں تو جیسے خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ادھر صرف آپا فاروق اور بکھو ہے جن کا کیس ابھی تک چل رہا ہے۔ برسات کی وجہ سے بیرک کی چھت اور دیواروں پر سے ٹکڑے اتر کر گر گئے ہیں۔ تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے بھاگ کر سکھر چلی جاؤں۔ ہمارے سائیڈ والے وارڈ میں میر علی احمد تالپور آئے ہیں۔ انہیں آج ایک سال کی سزا سنائی گئی ہے۔

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۳-۱۰-۷۰

رات کے ساڑھے آٹھ بجے

ابھی تک زکام اور کھانسی سے پیچھا نہیں چھوٹ رہا۔ سارا دن انتظار کرتی رہی کہ ملاقات آئے گی، آج سارا دن بیزار گذرا۔ نسیم بہت یاد آ رہی ہے۔ بیچاری کو تنہا چھوڑ آئی ہوں وہ بھی ضرور الجھ گئی ہوگئی۔

سینٹرل جیل حیدرآباد

۴-۱۰-۷۰

آج اماں کا خط آیا، لکھتی ہیں:

پیاری بیٹی زینا،

جئے سندھ

کل میں ساڑھے گیارہ بجے سامان لے کر جیل آئی تھی۔ درخواست بھیجی۔ ایک بجے تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ آخر بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی۔ باہر جالی میں سے میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے بات کی جس نے سرہندی کو فون کیا۔ سرہندی نے کہا کہ ۲۵ تاریخ کو سکھر میں ملاقات ہو چکی ہے اس لئے اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔۔۔

۔۔۔کل اچانک دروازے کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا جیسے تم سفید لباس میں، کتابیں اٹھائے کالج سے آ رہی ہو!

۔۔۔ میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ صرف مجھے تمہاری صحت کی فکر ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ نسیں نہ پھٹ جائیں، پھر کہتی ہوں فلسطینی لیلہ کی بھی تو ماں تھی، قرۃ العین طاہرہ کی بھی تو ماں تھی۔ لاکھوں ویت نامی انسانوں کی بھی تو مائیں ہیں۔ عظیم ہے وہ قوم جس کی عورتیں اور مرد بہادر لوگ ہیں۔ وہ قوم ہمیشہ زندہ رہے گی اور کبھی کسی کی غلامی قبول نہیں کرے گی۔ یہ تو سزا ہے لیکن اگر وہ تمہیں پھانسی بھی دے دیں تو بھی ہمیں کچھ نہ ہوگا۔ ایک نہ ایک دن تو یوں بھی مرنا ہے۔ بستر پر جان دینے سے میدان جنگ میں مرنا ہزار درجے بہتر ہے۔۔۔

میں پل پل تمہیں بہادری، سچائی اور جرات کی دعائیں دیتی ہوں۔ خدا تمہیں اس عظیم مقصد میں کامیاب کرے گا۔ تم کسی کی غلام نہیں بنو گی۔ تم میری ایک ہی بیٹی ہو اگر میری سو بیٹیاں بھی ہوتیں تو سندھڑی کی قسم! میں ان سب کو سندھ دیس کی دھرتی پر قربان کر دیتی۔۔۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، حیدرآباد

۶-۱۰-۷۰

رات نو بجے

کل سے ذہن میں پتہ نہیں کہاں کہاں سے باتیں اکٹھی ہوگئی ہیں۔ گھر کی باتیں، اپنوں کی باتیں، غیروں کی باتیں، اس لئے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ آج بھی اماں کا خط ملا ہے:

میری پیاری بیٹی

جئے سندھ!

کچھ دیر پہلے عزیزہ سومرو کا گایا گیت ''ہیلو کووری آ'' سنا بہت اچھا لگا۔ پہلے سے بھی اچھا۔ شاید تم سکھر جانے والی ہو۔ چلو کچھ وقت گذر گیا ہے اور باقی بھی گذر جائے گا، سمجھو، ہم جلدی ہی دوبارہ اکٹھے گھوما کریں گے۔ بہت باتیں کریں گے۔ کل تمہیں آخری سامان بھیجوں گی۔۔۔ آج تھوڑا سا ابراہم لنکن کو پڑھا، بہت اچھا لگا۔ اس انسان نے سخت محنت اور جدوجہد کی تھی۔ اگر کوئی انسان اپنے نصب العین کے لئے تندہی سے لگ جائے اور لگن سے کام کرے تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ ہم تو روپے میں سے ایک پیسہ کام کرتے ہیں اور پھر شور مچاتے ہیں کہ ہم نے بہت کام کیا ہے۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، سکھر

سینٹرل جیل، سکھر

۹-۱۰-۷۰

رات آٹھ بجے

کل صبح سکھر پہنچی۔ تھکن کی وجہ سے ڈائری نہ لکھ سکی۔ مجھے دوبارہ مردانہ ڈبے میں سفر کروایا گیا۔ شور شرابا کر کے میں ایک میٹرن کو ساتھ لے آئی۔ ہم حیدرآباد سے آدھی رات کو سوار ہوئے اور صبح چار بجے روہڑی پہنچ گئے۔ وہاں سے ریل کار میں سوار ہو کر سکھر پہنچے۔ صبح کو سات بجے تک اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔ پھر جیل کی گاڑی آئی اور جیل پہنچے۔ جیلر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس لئے باہر انتظار کرنا پڑا۔ اندر جانے کا اتنی شدت سے انتظار تھا کہ کیا بتاؤں۔۔۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پردیس سے لوٹ کر اپنے گھر جا رہی ہوں۔ اماں بشیراں (میٹرن) نے پہلے ہی جا کر بتا دیا ''اختر آئی ہے'' سب عورتیں دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دروازہ کھول کر اندر گئی تو نسیم اور باقی سب مجھ سے لپٹ گئیں۔ خدایا! اتنی خوشی ہوئی کہ کیا کہوں۔ سب کہہ رہی تھیں ''اختر حیدرآباد میں مزا آیا؟۔'' میں نے کہا 'بالکل نہیں! مجبوری کی وجہ سے گئی تھی ورنہ ہرگز نہ جاتی۔ یہ میری اتنی بہنیں ہیں انہیں چھوڑ کر کون جائے گا!۔'' گھر اور رشتہ دار یاد آتے ہیں مگر وقتی طور پر، ورنہ یوں لگتا ہے کہ جب سے آنکھ کھولی ہے، ان عورتوں کو دیکھتی آئی ہوں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۱-۱۰-۷۰

---یہاں جیل میں جس پر مس مہربان ہے، اس کا راشن بارہ مہینے برقرار رہتا ہے۔ مس جس کے لئے جتنا راشن کہتی ہے ڈاکٹر اتنا ہی لکھ کر دے جاتا ہے۔ ہم جب سے آئی ہیں تب سے آپا برکت کا ''خاص راشن'' لگا ہوا ہے۔ آپا برکت کوئی بیمار نہیں ہے مگر جب بھی ڈاکٹر آتا ہے وہ چادر اوڑھ کر ہانپتی کانپتی اور رونے کے انداز میں ڈاکٹر سے کہتی ہے ''ڈاکٹر صاحب! پتہ نہیں مینوں کی ہوگیا اے؟ ساری رات نیند نہیں آوندی، روٹی وی چنگی نہیں لگدی، ساری رات لتاں وچ درد رہندا اے!'' (پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ ساری رات نیند نہیں آتی۔ کھانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ساری رات ٹانگوں میں درد رہتا ہے) مزید بران، مس، آپا برکت کی بیماری کی تصدیق کردیتی ہے۔ کشور، جو نرس ہے، وہ آپا برکت کی سوتن بھی ہے، کہتی ہے ''ڈاکٹر صاحب بڑی بی (آپا برکت) کو روز رات کو بخار ہوجاتا ہے۔'' آپا برکت کے راشن کا دودھ مس کے حوالے ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ گوشت یا مچھلی بھی لے لیتی ہے۔ آپا برکت کو چائے کی پتی کا لالچ ہے اس لئے وہ یہ چیزیں چھ آنے چھٹانک کے حساب سے بیچ دیتی ہے۔ آج کل مس نے تاج کا راشن لگوادیا ہے۔ تاج مس کی اردلی ہے۔ دو تین دن ٹانگوں میں درد ہوا۔ مس نے ڈاکٹر سے کہہ کر فوراً داخل کروادیا اور اپنی مرضی سے راشن میں ڈبل روٹی، مکھن، دودھ، چینی، گوشت اور چائے کی پتی لکھوادی۔ جن میں سے مکھن، دودھ، ڈبل روٹی وہ خود لے لیتی ہے۔ تاج سارا دن

مس کے بچے کھلاتی رہتی ہے۔ جونہی میٹرن کی آواز گونجی ''ڈاکٹر صاحب'' تاج فوراً پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی کمبل لپیٹ کر لیٹ جاتی ہے جیسے اسے بہت تکلیف ہو!

میں اور نسیم یہ ڈرامہ دیکھ کر بہت ہنستی ہیں۔ مس جن دو چار لوگوں پر مہربان ہے ان کے علاوہ اگر کوئی قیدی سچ مچ بیمار ہو کر ہسپتال میں آئے تو مس ڈاکٹر کے سامنے اس کی بے عزتی کرنے سے بھی باز نہیں رہتی۔ ایک دم کہے گی ''کیا ہے! کیوں آئی ہو؟ حرام زادی! روز بیمار ہوتی ہے! جب یار کیا تب تو بیمار نہیں ہوئی تھی!'' ان عورتوں کیلئے ای پی سی کی پڑیا، کارمینٹو مکسچر کے علاوہ اور کوئی دوا نہیں ہے۔ ادھر تین بہت ضعیف عورتیں بیمار ہیں۔ انہیں راشن تو درکنار کوئی دوا تک نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ مس کی ''خاص'' قیدیوں کے لئے طاقت کے انجکشن بھی ہیں اور کھانسی کے مہنگے شربت بھی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۲-۱۰-۷۰

کل اتوار کا دن تھا۔ بیچاری قیدی عورتوں کو یہی ایک دن چھٹی کا ملتا ہے۔ وہ بھی کیسا؟ صفائی والیاں اتوار کو بھی لپائی کرتی ہیں' باورچی خانے والیوں کو بھی سارا دن پکانا پڑتا ہے۔ اتوار کو بیچاریوں نے کپڑے دھونا ہوتے ہیں، نہانا ہوتا ہے، پھٹے کپڑوں کی مرمت کرنا ہوتی ہے۔ مگر کل صبح سویرے اعلان ہوا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے گھر کے لوگ جیل گھومنے کے لئے آرہے ہیں۔ عورتیں اپنا کام چھوڑ کر انتظار میں بیٹھ گئیں۔ وہ تقریباً ۱۱ بجے آئے۔ ان لڑکیوں میں سے کچھ میری جان پہچان والی تھیں۔ مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک نے پوچھا 'کھانا کون سا ملتا ہے۔'' میں نے بتایا ''ہفتے میں دو مرتبہ گائے کا گوشت اور باقی دنوں میں روزانہ دو وقت دال۔' بولی ''اگر روٹی اور فروٹ گھر سے ملیں تو میں بھی بھوک ہڑتال پر بیٹھ جاؤں۔''

آج اماں کا خط آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

پیاری بیٹی زینا!

جئے سندھ

حالات کے مطابق جو بھی وقت گذرا، ٹھیک ہو گیا۔ شاہ لطیف کے بقول:

جو بہادر اور نہ جھکنے والے ہوتے ہیں

وہ تھوڑے دن زندہ رہتے ہیں

اور وہ چند دن بھی کبھی قلعوں میں

کبھی دربدر رہتے ہیں۔

سہیلی! یہ تو تھا ریل کا سفر وہ بھی صرف پانچ گھنٹے کا۔ سر چارلس نیپئر نے جب انگریزوں کے لئے سندھ فتح کیا تو کسی کام کے سلسلے میں اسے شکارپور سے لاہور جانا پڑا۔ پورے تین ماہ لگے، اس کا یہ سفر گھوڑے پر طے ہوا۔ کیا سمجھتی ہو؟ کمر اکڑ گئی ہوگی! پچھلے دور اور موجودہ دور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، سکھر

۱۴-۱۰-۷۰

آج صبح سویرے اٹھ کر شبنم سے تر گھاس پر چہل قدمی کی۔ عورتوں نے بتایا کہ ننگے پاؤں شبنم پر چلنے سے آنکھوں اور سر میں درد ختم ہو جاتا ہے۔ آج سارا دن ہسپتال کے گدے سیئے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۵-۱۰-۷۰

کل سے خانزادی سخت بیمار ہے۔ رات کو بہت چیخ چلا رہی تھی۔ میں نے کشور سے کہا کہ رپورٹ کروائے تو وہ کہنے لگی ''رات کو رپورٹ نہیں ہوگی۔ میڈیکل افسر کہتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے رات کو رپورٹ نہ کی جائے۔ اگر کوئی قیدی عورت مر بھی جائے تو اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔'' خانزادی کا آپریشن ہونا ہے مگر بارہ ماہ گذر گئے ہیں آپریشن کے لئے نہیں بھیج رہے۔ جب بھی درد ہوتا ہے تو کلوروفارم کا انجکشن لگا کر بیہوش کر دیتے ہیں۔ آج بھی وہی انجکشن لگا دیا گیا ہے۔ تقریباً ڈھائی ماہ بعد آج سندھی اخبار کا منہ دیکھا ہے۔ ویسے زنانہ وارڈ میں مس کے لئے روزانہ ''جنگ'' اخبار آتا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۶-۱۰-۷۰

سامنے والی کوٹھڑی میں کرماں دروازے کی سلاخوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی ہے اور زور زور سے کہہ رہی ہے ''او میری چھماں! (شمع) او میرے بیٹو منظور اور نظیر حسین!۔'' سارا دن اپنے بچوں کے نام لے کر روتی ہے۔ خاوند کے قتل کیس میں آئی ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔ اس کے دونوں بیٹے اس سے خفا ہیں اس لئے ملاقات کرنے بھی نہیں آتے۔ کہتے ہیں ''ہماری ماں کالی (کاری) ہے۔ اس لئے شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔''

آج کشور مجھ سے کہنے لگی ''سندھ میں عورتیں بہت خون کرتی ہیں۔'' میں نے کہا ''بی بی! خون نہ کریں تو کیا کریں؟ ادھر گاؤں میں وڈیرے کا راج ہے۔ جو پرائی بیٹی کا بھی وارث ہے۔ اس کی مرضی کے علاوہ اپنی بیٹی کی شادی بھی نہیں کرتا۔'' مجھے بھائی کے ایک افسانے کی ملوکاں یاد آئی کہ کیسے گوٹھ کے وڈیرے اور دوسرے لوگوں نے ملوکاں کے باپ کو دوسرے گاؤں میں رشتہ دینے سے روک دیا۔ ملوکاں نے مجبور ہو کر اپنے منگیتر یارو کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لی۔ پھر کس طرح وڈیرے نے پولیس کی مدد سے یارو اور ملوکاں کو ڈھونڈ کر گرفتار کروایا اور کیسے پولیس نے یارو اور اس کے ماں باپ کو مارا اور بے عزتی کی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۸-۱۰-۷۰

کل عید میلاد النبی (میٹھی عید) تھی۔ عورتوں نے یہ عید بھی جیل میں گھر کی طرح منائی۔ سب عورتوں نے میٹھا پکایا۔ کسی نے آٹے کا اور کسی نے سوجی کا۔ ہم نے بھی پکایا۔ سب نے ایک دوسرے سے تبادلہ کیا۔ بہت مزہ آیا۔ کئی عورتوں نے ساری رات جاگ کر قرآن پڑھا۔

آج اماں کا خط آیا۔ لکھا ہے:

میری پیاری بیٹی!

جئے سندھ!۔۔۔

آج میں جبیں کے پاس گئی تھی۔ تجھے بہت یاد کر رہی تھی۔ وہاں سسٹر یونس بھی بیٹھی تھی۔ سب کی زبان پر تمہارا نام تھا ''بی چارے!'' ان بیچاروں کو یہ بات عجیب لگ رہی تھی۔ انہیں یہ علم ہی نہیں کہ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں۔ ہمارے بلوچ خاندان میں مائیں اپنی اولاد کو جب وہ جھولے میں ہی ہوتا ہے، اس طرح مخاطب ہوتی ہیں:

''میرے چاند! میرے لال!

تم جلد از جلد بڑے ہو جاؤ،

کیونکہ تمہیں اپنے باپ کا بدلہ لینا ہے۔''

ویت نام کی مائیں بھی کہتی ہیں ''بیٹا سو جاؤ ابھی سونے کا وقت ہے

کیوں کہ تمہیں بڑے ہو کر رت جگے کاٹنے ہیں

اپنے وطن کی خاطر جنگ کرنی ہے۔''

تمہاری ماں

سینٹرل جیل، سکھر

۱۹-۱۰-۷۰

ویسے تو یہاں سب قیدی ہیں مگر قیدیوں کے بھی دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ چالاک، ٹھگ اور فریبی اردو بازوں کا ہے جبکہ دوسرا مسکین اور مجبور سندھی عورتوں کا۔ حق مارنے والوں میں آپا برکت، کشور اور اس کی دو تین ماتحت شامل ہیں۔ آپا برکت اور اس کی سوتن کشور پنجابی ہیں۔ ان دونوں کی زبانیں قینچی سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ دونوں مکر و فریب کی ماہر ہیں۔ مس کی چمچہ گیری کرنا بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ مس خود بھی اردو باز ہے۔ کشور سارا دن مس کے بچے کھلاتی ہے اور آپا برکت سارا دن مس کا جسم دابتی ہے اور اپنے راشن کے حصے میں سے کچھ دیتی ہے۔ دونوں سارا دن عورتوں کے خلاف مس کے کان بھرتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے ہمارے وارڈ میں عورتیں مس اور میٹرن سے زیادہ آپا برکت سے ڈرتی ہیں۔ لوگوں کی کمزوریوں کو پکڑنا اور پھر ان سے فائدہ اٹھا کر انہیں لوٹنا آپا برکت کا دھندا ہے۔ کسی سے راشن اور کسی سے مفت میں ازار بند اور بنیانیں بنوا کر بیچتی ہے۔ بیچاری عورتیں اس بات سے ڈرتی ہیں کہ آپا برکت کہیں مس سے ان کی چغلی نہ لگا دے اس لئے وہ جو بھی کام کہتی ہے عورتیں فوراً کر دیتی ہیں!

آج قائمہ ضمانت پر آزاد ہو گئی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۲۵-۱۰-۷۰

آج کوئٹہ کالج کی طالبات گھومنے آئیں۔ کئی قیدی عورتوں کے انٹرویو کئے۔ عورتوں کو یہ سب تماشہ لگ رہا تھا اس لئے وہ صحیح طرح سے جواب نہیں دے رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے تاج (قیدی) سے پوچھا ''تم کیوں آئی ہو؟'' تاج نے کہا ''میں بھی تمہاری طرح گھومنے آئی تھی تو پکڑ کر بٹھالیا۔'' پھر ایک دوسری لڑکی نے بختاور سے پوچھا ''تم کیوں آئی ہو؟'' بختاور نے کہا ''اپنے میاں کو کاٹا ہے۔'' لڑکی نے کہا ''کیسے کاٹا؟'' اس پر بختاور نے اشارے سے بلا کر کہا ''میرے نزدیک آؤ تو تمہارا گلا کاٹ کر دکھاؤں کہ ایسے کاٹا ہے!'' لڑکی خوفزدہ ہوکر بھاگ گئی۔ یہ لڑکیاں ہم سے بھی ملیں۔ ایک لڑکی میرا ہاتھ دیکھ کر کہنے لگی ''تم اس بار جلدی رہا ہو جاؤ گی لیکن دوسری بار زیادہ عرصہ جیل میں گذارو گی۔'' میں نے کہا ''تمہارا علم جھوٹا ہے میں تیسری بار جیل میں آئی ہوں۔''

سینٹرل جیل، سکھر

۵-۱۱-۷۰

آج رمضان کا چوتھا روزہ ہے۔ ادھر سب عورتیں باقاعدگی سے روزے رکھ رہی ہیں۔ مس سب کو زبردستی روزے رکھواتی ہے۔ روزوں کی وجہ سے سارے وارڈ میں سستی پھیلی ہوئی ہے۔ اتنے دنوں میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہوئی۔

سینٹرل جیل، سکھر

۸-۱۱-۷۰

اتوار کو یاد کر رہی تھیں، آج پھر اتوار آ گیا۔ آج کراچی سے چار عورتیں آئی ہیں۔ ایک عورت پاگل ہے اور ایک کا ایک چھوٹا بچہ ہے۔ ان عورتوں کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر مجھے اپنا دن یاد آ گیا جب ہم بھی اسی طرح خوفزدہ تھیں۔ ایک عورت کو بہت بھوک لگی تھی وہ بیچاری بڑی مشکل سے میٹرن کے پاس گئی۔ میٹرن نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا ''یہ سکھر جیل ہے۔ یہاں آتے ہی کھانا نہیں مل جاتا۔'' میں نے اس عورت کو روٹی دے دی۔

سردی کافی بڑھ گئی ہے۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کی وجہ سے سب کو ٹھنڈ لگی ہوئی ہے۔ مجھے چار پانچ روز سے سر اور آنکھوں میں درد رہتا ہے۔ کبھی زیادہ، کبھی کم۔ میں نے چوتھے روز ڈاکٹر سے بات کی وہ بولا ''دوا لکھ دیتا ہوں۔'' پھر وہ کل آیا اور کہنے لگا ''دوائی شہر سے منگوا بھیجی ہے۔'' میں پچھلے چار دن سے دوا کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۴-۱۱-۷۰

جیل میں چار بھیل (سندھ کی ہندو خانہ بدوش قوم) لڑکیاں بھی ہیں۔ جنہیں مس نے سزا کم ہونے کے جھوٹے دلاسے، قیامت کے عذاب اور جنت کے عیش و آرام بتا کر مسلمان کرلیا ہے۔ آج تین سال بعد ان میں سے ایک، رتنی کے بھائی کا خط آیا۔ رتنی خط سن کر سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اس کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔ عورتیں اس سے کہنے لگیں ''تم اب مسلمان ہو تمہارا اب اپنے عزیزوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس لئے ان کے خط کا جواب نہ دینا''۔ کچھ دوسری عورتوں نے کہا ''بھائیوں کو خط میں لکھ کر بھیج دو کہ میں مسلمان ہوگئی ہوں میرا اب تمہارے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ آئندہ مجھے خط نہ لکھا کرو۔'' مگر رتنی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ رتنی کو خاموش دیکھ کر میں نے سوچا کہ کہوں ''رتنی، جو کچھ تمہارے دل میں ہے اس کا مجھے علم ہے۔ سب سے کہہ دو مجھے تمہاری جنت نہیں چاہئے، میں بھیل ہی اچھی ہوں۔ مجھے اپنے بھائی اور ماں باپ سب سے بڑھ کر پیارے ہیں۔ میں ان کی ہوں اور انہی کے پاس جاؤں گی۔ میرے عزیز دن رات میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ میری سزا کے دن انگلیوں پر گنتے ہوں گے!'' مگر رتنی صرف رو رہی تھی۔

رتنی تو روتی ہوئی چلی گئی مگر میں کتنی ہی دیر تک پلنگ پر لیٹی روتی رہی۔ مجھے نسیم کھرل کا افسانہ ''کافر'' یاد آ گیا، جس میں ایک اوڈ اپنی بیوی سمیت مسلمان ہوگیا تھا۔ اس نے مسلمانوں سے پوچھا ''اگر میں مرجاؤں تو میری بیوی کا کیا بنے گا؟'' انہوں نے کہا ''ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ نکاح کرلے گا۔'' وہ اوڈ پھر پوچھنے لگا ''اور اگر میری بیوی پہلے مرجائے تو کیا تم میں سے کوئی مجھے رشتہ دے گا؟'' اس پر سب مسلمان اسے مارنے کو دوڑ پڑے اور بولے ''تم ہمیں گالیاں بک رہے ہو۔ ہم فلاں اونچی ذات والے تجھ اوڈ کو کیسے رشتہ دے دیں گے؟'' کہتے ہیں نا کہ کتا بھی اپنے خاندان میں اچھا لگتا ہے!

سینٹرل جیل، سکھر

۱۵-۱۱-۷۰

رات ۱۲ بجے

آج سی کلاس کی دوسری طرف کی بیرک کی سب عورتیں ہمارے پاس مہمان بن کر آئی ہیں۔ یہاں عورتیں ایک دوسرے کی بیرک میں مہمان بن کر جاتی ہیں۔ ہم نے سب کی میزبانی کی۔ اس وقت گا بجا کر اور ناچ کر سوئی ہیں۔

آج صبح ایک بات کی وجہ سے سارا دن پریشان رہی۔ ہوا یوں کہ سی کلاس کی پرلی بیرک میں روزانہ کسی نہ کسی کی روٹی چوری ہو جاتی تھی۔ دو تین دن کی تلاش کے بعد آخر آج ایک نئی آئی قیدی عورت کو روٹی سمیت پکڑ لیا گیا۔ وہ عورت اس بیرک کی صفائی کرتی ہے۔ اس نے جیسے ہی روٹی اٹھا کر نیفے میں ڈالی، دو عورتوں نے اسے دیکھ لیا۔ پھر تو ہنگامہ شروع ہو گیا۔ عورت کو بالوں سے پکڑ گرایا اور اس کی قمیص کے نیچے سے روٹی نکالی گئی۔ پھر کئی قیدی عورتوں اور میٹرنس سب نے مل کر اسے مارا پیٹا۔ اس کا دو سال کا بیٹا زمین پر گر پڑا۔ اسے بھی چوٹ لگی۔ یہ عورت اپنی ساس اور نند سمیت جیل میں ہے۔ اس نے چلانا شروع کیا۔ وحشیوں کی طرح ایک عورت کو پٹتا دیکھ کر میں نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری کون سنتا؟۔ اس عورت نے بتایا ''میرا بچہ دودھ پیتا ہے، مجھ سے زیادہ کام کرواتے ہیں، اس لئے مجھے بہت بھوک لگتی ہے، یہاں کتنی بے رحمی کی بات ہے۔ اس غریب عورت کا چھوٹا بچہ ہے۔ اس سے بیرک کی صفائی بھی کروائی جاتی ہے اور لپائی کیلئے سارا دن پانی بھی بھرواتے ہیں۔ اس لئے اس کے بچے کو ہمیشہ کھانسی اور زکام رہتا ہے۔ دوسری جانب آپا برکت جیسی موٹی اور تگڑی عورتیں پل رہی ہیں، جنہیں مس نے کام سے معافی دے رکھی ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۷۰-۱۱-۱۶

رات ۱۱ بجے

آج قائمہ اپنی ضمانت رد کروا آئی ہے۔ کہنے لگی ''ہمارے گاؤں کے وڈیرے نے میرے رشتہ داروں سے کہا ہے کہ میں قائمہ کو چھڑوالوں گا بشرط کہ تم اسے میرے حوالے کردو۔'' مجھے یہ شرط منظور نہیں، اس لئے میں نے اپنی ضمانت رد کروادی ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۱۸-۱۱-۷۰

اتنے دنوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ آج بھائی کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے:

زینا!

جئے سندھ!۔۔۔

ابھی ابھی دوسری جنگ عظیم میں روسی فوج کی شکستوں اور فتوحات کی تاریخ پڑھ کر رکھی ہے۔ ایک ہی پل میں خیالات نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ ہماری خوشیاں اور غم دوسری عظیم قوموں کے انسانوں کے مقابلے میں کتنے کمتر، حقیر اور نہایت ہی چھوٹے ہیں! ہم کتنے چھوئے اور پست انسان ہیں! ہمیں کتنا بڑا، کتنا وسیع، کتنا سچا، سورما اور کتنا شاندار ہونا چاہئے۔۔۔

بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہمارے اس دیس میں سچائی، خلوص، قربانی، سچی اور بے لوث ہمدردی اور اپنائیت کا کوئی وجود نہیں رہا۔ کسی میں بھی فراخدلی، مستقل مزاجی، حوصلہ اور اعتماد نہیں۔ ہر شخص اپنے کمینے پن، انتہائی گری ہوئی تنگ نظر جبلتوں اور جاہلانہ خواہشات کا قیدی ہے۔ لوگوں کو خود بھی یہ علم نہیں کہ ان کا ذاتی فائدہ کن باتوں میں ہے اور اس کے لئے کونسا راستہ زیادہ موزوں ہوگا۔ اگر لوگ صرف اپنے ذاتی مقاصد بھی اچھے، موزوں اور زیادہ سے زیادہ کارگر طریقے سے پورے کرتے تو بھی دنیا اتنی ناقابل برداشت نہ ہوتی۔ اگر ان پر مکھیوں کا جھرمٹ نہ اٹا ہوا ہو تو آدمی گڑ اور تیل کی مٹھائی بھی کھا لے۔ یہاں نہ صرف خواہشیں اور مقاصد ہی نچلے درجے کے ہیں بلکہ انہیں حاصل کرنے کے طریقے ان سے بھی زیادہ

گندے اور گھٹیا ہیں۔ بے حیائی دیکھ کر، سمجھ کر اور سن کر شرم سے سر جھکا لینے کو بے وقوفی اور نادانی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ نومبر اور رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ گذشتہ دو سالوں سے کڑی آزمائش کا مہینہ بن کر رہ گیا ہے۔ دو سال پہلے نومبر اور رمضان کے دوران میں جیل میں تھا۔ گذشتہ سال تم نومبر اور رمضان کے مہینے میں جیل میں تھیں اور اس سال بھی تم اسی طرح نومبر اور رمضان کے مہینے میں جیل میں ہو۔ گذشتہ سال اسی مہینے میں میں اور تمہاری اماں جامشورو میں سخت بیماری کے بعد کھڑے ہو سکے۔ اس سال بھی دونوں کی ویسی ہی حالت ہے۔ البتہ اس بار ہسپتال کی جگہ گھر میں ہیں۔ گذشتہ سال بھی ہمارے لئے عید کی کوئی خوشی، خوشی نہ تھی اور اس سال بھی وہی اداسی اور وہی انتظار ہوگا۔ دو سال پہلے میں نے عید جیل میں کی اور تم نے پچھلے سال بھی عید جیل میں منائی اور اس سال بھی جیل میں ہی مناؤ گی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ زندگی کی یہ انمول، تلخ، بچھڑی ہوئی اور تنہا عیدیں دیس اور دیس کے لوگوں کے لئے کس قدر بھلی، میٹھی اور خوشیوں سے بھری عیدیں بننے کا سبب بنیں۔ ان اجنبی عیدوں نے ہمیں کتنی اپنائیت، خودشناسی، دوسروں کو پہچاننے اور شناسائی کا سرمایہ دیا۔ ہماری زندگی میں کس قدر نیاپن اور نرالا ہونے کا احساس پیدا کیا۔ ہماری زندگیاں کتنی بامعنی، بھرپور اور بامقصد بن گئیں۔

رسول بخش

سینٹرل جیل، سکھر

۴-۱۲-۷۰

عید آئی اور گذر گئی۔ عید کے روز صبح سویرے سب عورتیں اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ گذاری پہلی عیدیں یاد کرتے ہوئے رونے لگیں۔ تقریباً گیارہ بجے سب نے گھریلو لباس پہنا۔ بارہ بجے ''صاحب'' اپنے لشکر سمیت آیا جسے چار ضعیف عورتیں جھک کر ملیں۔ چھوٹا یوسف بھی جھک کر ملنے کے بعد بولا ''صاحب، خدا کرے آپ کی کرسی سلامت رہے!!''۔

صاحب کے جانے کے بعد سب عورتیں ایک دوسری سے عید ملیں اور پھر سی کلاس میں آ کر اکٹھی ہوگئیں۔ وہ ٹین کے ڈبوں کی ڈھول بجا کر ناچنے گانے لگیں۔ بہن پٹھانی نے جھومر کا رقص کیا۔ اماں دولت (میٹرن) نے بلوچی رقص کا مظاہرہ کیا۔ تاج نے پشتون ناچ ناچا۔ ہم نے جمالو گایا۔ بہت لطف رہا۔ سب عورتیں بہت خوش تھیں، صرف قائمہ عید کے روز بھی روتی رہی۔ عید کے دن ہمیں دودھ والی سویاں ملیں۔ رات کو بھی بی کلاس والے سی کلاس میں رہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۵-۱۲-۷۰

سات تاریخ کو قومی اسمبلی کے الیکشن ہونے والے ہیں۔ اس لئے سارا دن انتخابات کے بارے میں تبصرہ ہوتا رہا۔ جو میٹرن باہر سے ہو کر آتی ہے اسے عورتیں گھیر لیتی ہیں کہ باہر کے حالات کے متعلق کچھ بتائے۔ یہاں تمام سندھی عورتیں پیپلز پارٹی کی حمایتی ہیں۔ ہم سے بھی سارا دن پوچھتی رہیں ''بہن کون جیتے گا؟''۔ ''کیا بھٹو صدر بن جائے گا؟''۔ ''کیا بھٹو ہم قیدیوں کے لئے کچھ کرے گا؟''۔ ''کیا بھٹو جیل خالی کروادے گا؟''۔ میں عورتوں سے کیا کہتی کہ کون جیتے گا؟ کوئی تمہارے لئے کیا کرے گا؟ ہمیں تو خود اس کا پتہ نہیں۔

عورتیں سارا دن بیٹھی بھٹو کے جیتنے کیلئے نمازیں پڑھتی، منتیں مانتی رہیں۔ کئی عورتوں نے بھٹو کیلئے ''بیت'' بنائے ہیں۔ کچھ نے خواب دیکھے ہیں کہ ''کوئی شخص ہماری سزا کی کتابیں پھاڑ رہا ہے! اور جیل کے دروازے کھول کر کہہ رہا ہے ''تم آزاد ہو!''۔

عورتیں کہتی ہیں کہ وہ شخص یقیناً بھٹو ہے۔ آج بھائی کا خط آیا ہے۔

سینٹرل جیل، سکھر

۸-۱۲-۷۰

کل الیکشن تھے۔اس لئے جیل میں چھٹی تھی۔سب کو نتائج کا شدت سے انتظار تھا۔آج صبح جیل کھولی گئی۔میٹرن نے بتایا کہ بھٹو جیت گیا ہے۔یہ سنتے ہی عورتیں ناچنے اور ڈھول پر گانے بجانے لگیں۔انہوں نے اعلان کیا: ''آج ہم کام نہیں کریں گی''۔ تھوڑی دیر کے بعد مس آئی اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''مبارک ہو اختر! تمہارا بھٹو جیت گیا۔اسے زیادہ ووٹ ملے ہیں''۔ یہ سنتے ہی آپا برکت کہنے لگی ''ہر ایک اپنے لئے کرتا ہے۔بھٹو آیا ہے تو ہمارے لئے کیا کرے گا۔'' آج سارا دن عورتوں نے خوشیاں منائیں۔

سینٹرل جیل، سکھر

۹-۱۲-۷۰

آج وارڈ میں سارا دن جھگڑا ہوتا رہا۔ پہلا جھگڑا اس بات پر ہوا کہ ایک نئی قیدی عورت اور ایک پرانی قیدی عورت کسی بات پر آپس میں الجھ پڑیں۔ ایک نے کہا ''شوہر مار کر اب نخرے کر رہی ہو۔'' اس عورت کا اتنا ہی کہنا تھا کہ جتنی عورتیں اپنے شوہروں کے قتل مقدموں میں آئی ہوئی تھیں انہوں نے اسے پکڑ لیا اور خوب مارا پیٹا۔ کہنے لگیں ''ہم تمہارا شوہر تو مار کر نہیں آئیں، جو طعنہ دے رہی ہو! اپنا شوہر مار کر آئی ہیں۔'' یہاں اگر کسی عورت کو اس قسم کا طعنہ دیا جائے تو جتنی بھی عورتیں اس کیس میں آئی ہیں وہ سب طعنہ دینے والی پر اکٹھی جھپٹ پڑیں گی اور اسے مارنے پیٹنے سے ہرگز گریز نہیں کریں گی۔

دوسرا جھگڑا دو میٹرنس اور خانزادی کے درمیاں ہوا۔ بچوں کو ہر روز ایک ایک پاؤ دودھ ملتا ہے۔ بچوں کی مائیں یہ دودھ میٹرنس کو قیمتاً دے دیتی ہیں۔ میٹرنس روزانہ ایک پاؤ دودھ کے بدلے انہیں مہینے میں ایک روپیہ دیتی ہیں۔ کل خانزادی نے یوسف کی ماں سے کہا ''میں بیمار ہوں۔ تم یوسف کا دودھ مجھے دے دو۔ میں تمہیں مہینے کے دو روپے دے دوں گی''۔ یوسف کی ماں روپے کی لالچ میں اماں فاطمہ (میٹرن) کی جگہ دودھ خانی کو دینے لگی۔ آج اماں فاطمہ اور اماں چھوٹی آ کر خانی سے لڑنے لگیں اور بولیں: ''تم قیدی عورتیں میٹرنس کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہو۔ ہم بھی دیکھتی ہیں کہ دودھ کسی اور کو کیسے ملتا ہے۔ تم سے تو اب ہم روٹیاں بھی نہیں لیں گی۔ ہر روز تمہاری تلاشی لیں گی، اور دیکھیں گی کہ وارڈ میں پیاز کا چھلکا تک کیسے آتا ہے۔ اور تمہارے بنائے ہوئے ازار بند اور بنیان کیسے بکتے ہیں۔''

یہ تقریر سن کر بیچاری خانی نے پاؤں پڑ کر معافی مانگی اور یوسف کی ماں نے اماں فاطمہ کو دوبارہ دودھ بیچنا شروع کر دیا۔

حیدرآباد

۱۹-۱۲-۷۰

رات سوا بارہ بجے

میں اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ میرے ایک طرف چھوٹا ایاز سویا ہوا ہے۔ ہم کل شام رہا ہو گئیں۔

کل صبح اٹھ کر باورچی خانے میں چائے پینے گئیں تو جیل کا ریڈیو کافی دنوں کے بعد اچانک بجنے لگا وہاں سے یہ کافی نشر ہو رہی تھی ''جیکر ہوئیس دھاری، الا الا، مارن تڈہاں وساری!'' کافی سننے کیلئے ہم سب بی کلاس کے آم کے درخت کے نیچے اکٹھی ہو گئیں کیونکہ وہاں تک ریڈیو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دو تین تو سسکیاں لینے لگیں۔ کافی کے بعد سندھی خبروں میں اعلان ہوا کہ صدر یحیٰ نے سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تقریباً دس بجے اماں اور بھائی ملاقات کیلئے آئے۔ انہوں نے کہا ''آئے تو ہم ملاقات کیلئے تھے۔ مگر صبح خیر پور ریڈیو اسٹیشن سے صدر کا اعلان سنا۔ اب مل کر حیدرآباد چلیں گے۔ بھائی تقریباً پانچ منٹ بیٹھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم بی کلاس کی طرف دوڑیں۔ عورتیں پوچھتی رہیں ''کیا ہے؟''۔ ہم نے بتایا ''ہم تھوڑی دیر کے بعد آزاد ہو جائیں گی''۔ یہ بات سن کر سب اکٹھی ہو گئیں۔ بہت سوں کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ بعض کہنے لگیں ''بہن باہر جا کر بھٹو سے ہمارے لئے کہنا!''۔ ''بہن دعا کرنا کہ ہم بھی تمہاری طرح یوں اچانک رہا ہو جائیں!''۔

سب عورتیں کہنے لگیں ''ہمیں آخری بار خط لکھ کر دے جاؤ!'' اور پھر میں خط لکھنے میں لگ گئی۔ ایک ایک عورت نے تین تین چار چار خط لکھوائے، اس دن کم از کم

سو، سوا خط لکھے۔ اماں خانی (کیونکہ میں انہیں اسی نام سے پکارتی تھی) نے ہمارے لئے سویاں پکائیں پر ہم سے خوشی کے مارے کھائی نہیں گئیں۔ خوشی کا وہ عالم تھا کہ تمام عورتوں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی دل میں عجیب ہیجان کا ملا جُلا تاثر تھا، اسی دوران مجھے اپنا پہلا دن یاد آیا، آہستہ آہستہ وہ تمام لمحے آنکھوں کے سامنے آ گئے جو یہاں گذارے تھے ہر عورت کے ساتھ پہلی ملاقات کا منظر آنکھوں میں گھومنے لگا۔ گرمیوں کی وہ چاندنی راتیں یاد آئیں، جب ہم سب ملکر سہرے گایا کرتی تھیں۔ اکثر جب وہ مجھ سے خطوط لکھواتی ہیں تو اچانک دھاڑیں مار کر رو بھی دیتی تھیں، بیماری کے دوران ان کا تسلی دینا اور دعائیہ کلمات ادا کرنا سب یاد آیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ان جیسے مظلوم، معصوم اور پیارے لوگوں کو چھوڑ کر جا رہی ہوں شاید ان سے کبھی پھر ملاقات نہ ہو، دل میں آیا کہ ایک ایک سے دل کھول کر ملاقات کروں۔

اماں خانی نے مجھے گلے لگا کر کہا کہ ''اختر! تم بھی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہو۔'' اماں خانی کا اتنا کہنا تھا اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میرے روتے ہی اماں خانی اور دوسری تمام عورتیں ملکر باقاعدہ رونے لگیں اور کافی دیر کے بعد جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اسی وقت میٹرن نے آ کر کہا کہ اب ہمیں رخصت ہونا چاہئے۔ یہ سنتے ہی ہم ایک دوسرے سے گلے ملکر رخصت ہونے لگے۔ سب عورتیں جیل کے چھوٹے دراوزے سے باہر نکل آئیں۔ تمام عورتیں ہاتھ ہلا کر ہمیں رخصت کر رہی تھیں اور بار بار مجھے کہہ رہی تھیں کہ ''اختر! ہمیں یاد رکھنا، ہمیں مت بھلانا، ہمیں مت بھلانا!!''۔

ناري پبليڪيشن جا شايع ٿيل ڪتاب جيڪي وڪري لاءِ موجود آهن

1	روشن چانورو (ڪهاڻيون)	ثميرا زرين	=/50
2	پيار جو آئينو (ناول)	وسنوا پاتيا	=/25
3	داستان مير (شاعري)	مير غلام الله خان تالپور	=/50
4	هٽ ريڪائن ڪان خالي (ناول)	محمود مغل	=/20
5	علي بابا گم (بالڪ ناول)	هوند راج بلوائي	=/20
6	اسين جيئرا آهيون (آتم ڪٿا)	ترجمو: محمود مغل	=/75
7	هٿين هٽ ڪڙول (جيل ڊائري)	طارق اشرف	=/100
8	ماندي ٿي نه مارئي (شاعري)	استاد بخاري	=/100
9	ستارن ۾ لڪيل سوڪي جي ڪهاڻي (آتم ڪٿا)	ايريا انجنيئرنگ موتن	=/100
10	جيون ليکا (ناول)	منصور ٽلهو	=/80
11	غزل چو نه چوان (شاعري)	نذير ناز	=/150
12	نم جي چانوري ۾ (شاعري)	عذرا سرور	=/100
13	جي هانءُ نه هاري (ڪهاڻيون)	منصور ٽلهو	=/80
14	اڏور جاهتون مين گهري اڏوري لڙڪي (شاعري اردو مين)	مونا رائو علي	=/100
15	زندگي يوگ (ناول)	منصور ٽلهو	=/50
16	رڌڻي جي راڻي (رڌ پچاءِ جو ڪتاب)	پونم بلوائي	=/50
17	ڪيئن وساريان ويڙيچن (يادگيريون)	وينا شرنگي	=/50
18	شمع پارينديِ شب برهه باڪيون ڪڏيون (شاهه عبداللطيف تحقيقي مضمون)	نذير ناز	
19	بول ڪ سچ زنده هي اب تک (جيل ڊائري)	اختر بلوچ	=/150
20	لهرون کا لباس (مقالا. مضمون ڪهاڻيون)	نذير ناز	

ناري پبليڪيشن جا شايع ٿيل ڪتاب

1	هيلُ نه ڪو سنگ ڪاڏم	نذير ناز	5 مڱگزين
2	ڪل جا خستوري	نذير ناز	5 مڱگزين
3	منهنجون اکيون آليون	نذير ناز	5 مڱگزين
4	ڏاهيون ڏک ڏسن	نذير ناز	5
5	مان آڪ جوپن	نذير ناز	5
6	اجايل ناري	نذير ناز	6
7	اُڏران ها هُن پار	نذير ناز	6
8	تنهنجي تند تنوار	نذير ناز	6
9	ڏيئا ڏيئا لات اسان	نذير ناز	6
10	ڏندلا ڏندلا خواب	نذير ناز	6
11	هي ڪهڙو هنڌ ڻ	نذير ناز	6
12	هڪ چوڪري عجيب ملڪ ۾	نذير ناز (ٻارن لاءِ)	6
13	هنج	نذير ناز (ٻارن لاءِ)	6
14	سوني زنجير	حميد سنڌي (ٻارن لاءِ)	6
15	هيلوڪوپٽر آ (ڪهاڻيون)	نذير ناز	15
16	راڻا جي راجپوت (ڪهاڻيون)	حميد سنڌي	12
17	جهرڻا (ڪالم)	نذير ناز	15
18	پياسي ڏرتي ۽ پياسي دلڙيون	ڪرشن چندر	12
19	زلزلو (ناول)	ڊاڪٽر نجم عباسي	30
20	روپ ۽ بهروپ (ناول)	خواجه احمد عباس	10
21	وڇوڙو (ڪهاڻيون)	سنڌري اتم چنداڻي	15
22	سنگت رک سچن سان (مڱگزين)	نذير ناز	20

لکپڙهه لاءِ ڪتاب گهرائڻ لاءِ ايڊريس

ناري پبليڪيشن 443/3 صدر حيدرآباد

”میں تجھ پر جتنا فخر کروں کم ہے، مجھے فقط تیری صحت کا فکر ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ تم تو پھنس گئی ہو۔ مگر ساتھ ہی سوچتی ہوں کہ فلسطینی لیلیٰ خالد کی بھی تو ماں تھی۔ لاکھوں ویتنامیوں کی بھی مائیں تھیں۔ قرۃ العین طاہرہ کی بھی ماں تھی۔ عظیم وہ قوم ہے جس کی عورتیں اور مرد بہادر ہیں۔ ایسی قوم ہمیشہ زندہ رہے گی، کبھی کسی کی غلام نہیں بنے گی۔ یہ تو جیل کی سزا ہے۔ اگر تجھے پھانسی دیں تب بھی ہم نہیں ہلیں گے۔ ایک دن تو ویسے بھی مرہی جانا ہے۔ بستر پر مرنے سے میدان جنگ میں مرنا ہزار ہا بار بہتر ہے۔ میری ہر دم تمہارے لئے بہادری، سچائی اور جرأت سے ڈٹ جانے کے لئے دعائیں ہیں۔ خدا تجھے اپنے عظیم مقصد میں کامیاب کرے گا۔ تو کسی کی غلام نہ ہوگی۔ تُو تو میری ایک بیٹی ہے۔ اگر میری ایک سو بیٹیاں ہوتیں تو میں سندھ کی قسم سب کو سندھ دھرتی پر قربان کر دیتی“

ماں زرینہ بلوچ کا اپنی بیٹی اختر بلوچ کو جیل میں بھیجے گئے خطوط سے ایک اقتباس